Women Writ

Classi s

افسانے

جھری میں سے

عصمت چغتائی

RHOTAS LPS
Low Priced Series

جھری میں سے

افسانے

عصمت چغتائی

روہتاس بکس

1992ء	اشاعت اول
نفیس پرنٹرز پٹیالہ گراؤنڈ لاہور	پرنٹرز
روہتاس بکس احمد چیمبرز - ٹیمپل روڈ لاہور	پبلشرز

جھری میں سے

ترتیب

چارپائی	5
جھری میں سے	15
گیندا	22
شادی	36
جوانی	49
ڈائن	57
بچپن	74
تاریکی	82
کافر	89
نیرا	99

چارپائی

میرن میاں ٹاٹ کے پردے کے پیچھے سے اس طرح زناٹے کے ساتھ نکلے جیسے بندوق سے گولی۔ ڈگمگاتے ہوئے وہ مسجد کی سیڑھیوں پر ڈھے گئے۔ ان کے چہرے پر یتیمی سی برس رہی تھی۔ گلی کے کتے نے ان سے چھیڑ خانی کرنے کی کوشش کی، مگر انہوں نے بھنا کر ایسی لات رسید کی کہ وہ بھنبھناتا ہوا سرکی والے کی دوکان کی سیڑھی کے نیچے دبک گیا۔

مرزا اپنے سٹور میں تالا مار کر میرن میاں کو نرم نرم نگاہوں سے دیکھنے لگے-----

"کیا بات ہے میرن میاں؟"----- مرزا نے کندھے پر پڑے ہوئے رومال سے سیڑھی پر وار کیا اور میرن میاں کے پاس ہی بیٹھ گئے۔

میرن میاں نے ایک لمبی سی ڈور مغلظات کی کھینچی اور اپنے خضاب آلودہ بالوں کو جھٹکے دینے لگے۔

"اس کی بہن...... چارپائی ٹوٹ گئی۔"

"چارپائی؟"

"تم نہیں سمجھو گے میاں۔"

مرزا نے جیب سے بیڑی نکال کر سلگائی اور میرن میاں کو تھما دی اور دوسری اپنے لئے کھینچنے لگے۔ دو چار کش لے کر میرن میاں نے مرزا کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ پھر بڑی حسرت سے بولے۔ "ابھی کنوارے ہو صاحبزادے اونٹ پہاڑ تلے نہیں آیا میری مانو تو کبھی بھول کر بھی بیاہ نہ کرنا۔"

"مگر بی اماں ہر خط میں لکھتی ہیں بیٹا تیرے سہرے کے پھول میرے جیتے جی...... وغیرہ وغیرہ۔"

"جی------ اور؟"

"وہی پوتا کھلانے کا ارمان...... بس یہی دو چار ہتھکنڈے ہیں جنہیں دنیا بھر کی عورتیں استعمال کرتی ہیں۔" مرزا صاحب کہتے کہتے ہنسنے لگے۔

"سب عورتیں جادوگرنیاں ہوتی ہیں۔" مرزا جی نے بیڑی کا دھواں نتھنوں سے نکالتے ہوئے اس کبوتر کی طرح خونی نظروں سے دیکھا جو کبوتری کے آگے تھرک رہا تھا۔" مرد کی ذات بڑی احمق ہوتی ہے۔" انہوں نے جوتا اتار کے کبوتروں کے کھینچ مارا۔ دونوں کبوتر اڑ کر سرکی والے کی ممٹا پر جا بیٹھے۔ وہ نر کبوتر پھر ڈھٹائی سے کبوتری کے آگے ناچنے لگا۔ "مرزا کبھی عورت کے چکر میں نہ پڑنا سمجھے؟ دیکھو میری زندگی ایک چارپائی کی طرح ہے۔ چارپائے میری چاروں بیویاں، جھلنگے میں میری لاش پڑی ہے۔ جب چارپائے ٹکراتے ہیں تو میری لاش اوندھی ہو جاتی ہے۔"

"تو پھر آپ نے چار شادیاں کیوں کر ڈالیں؟" مرزا پھر ہنسنے لگے۔

"قسم سے میں نے خود تو ایک شادی بھی نہیں کی۔ پہلی تو ٹھیکرے کی مانگ تھی۔ والدہ صاحبہ، اللہ انہیں جنت نصیب کرے۔ اپنی بھتیجی میرے سر منڈھ گئیں۔ دو سال مجھ سے بڑی ہو گی۔"

"وہ کیسے؟" ٹھیکرے کی مانگ تو......"

"ارے میاں مانگ والی تو اللہ کو بچپن پیاری ہوئی۔ اس کی بڑی بہن میرے پلے پڑی۔ سولہویں سال میں تھا کہ نکاح پڑھوا دیا۔"

"مگر دوسری تو آپ نے اپنے شوق سے کی۔"

"ارے نہیں میاں۔ دنیا جانتی ہے، دوسری نے مجھے پھانس لیا۔"

"اور آپ پھنس گئے؟"

"بڑی سے کبھی میرا دل نہ ملا۔ سالی کو بچے دینے ہی سے فرصت نہ تھی جب

دیکھو ایک گود میں دوسرا کوکھ میں۔ جدھر دیکھو موت میں بھیگے پوتڑے۔ نیک بخت ایک پوتڑا بن گئی۔ جی کھٹا ہو گیا اور پھر طلاقن سے شادی کرنا کار ثواب بھی تو ہے۔"

"تو پھر آپ نے کمایا جی بھر کے ثواب۔"

"خالہ جان نے جینا دو بھر کر دیا۔ رو رو کر سمندر بھر ڈالے۔ پکڑ کے جوت دیا کولہو میں' اور اندھیر دیکھو' خصم نے اسے بانجھ کہہ کر طلاق دی تھی۔ میرے گھر آتے ہی الٹیاں لگ گئیں۔ پتہ نہیں اسے خواہ مخواہ شادیاں رچانے کا شوق کیوں چراتا ہے' سالے نے تیسری بھی کر ڈالی۔ مگر پھونسڑا بھی پیدا نہ ہوا۔ ادھر یہ حال ہے کہ سالی کسی عورت کے پاس سے بھی گزر جائیں' تو اس کی گود ہری ہو جاتی ہے۔"

"اور تیسری؟"

"دوسری کو جاپے میں بخار لگ گیا۔ وہ میکے میں پڑی جوجھ رہی تھی۔ بڑی نے نہ جانے کیسے پٹی پڑھائی اور پھنسوا دیا۔"

"یعنی سوت ہی سوت لے آئیں!" مرزا نے قہقہہ لگایا۔ "یہ عورت ذات بھی عجیب شے ہوتی ہے۔"

"ان دنوں اپنی آمدنی بھی خوب تھی۔ ریلوے میں اوپر کی آمدنی کے ہزاروں طریقے ہیں۔ آ گیا گھپلے میں۔ دوسری نے سنا تو سر پیٹتی بھاگی آئی۔"

"مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔" مرزا نے بدھنے میں وضو کے لئے پانی بھرا اور مسجد کی موری پر بیٹھ گئے۔

اور منجھلی نے اپنی کمان اترتے دیکھی تو اپنی خالہ کی لڑکی بھڑا دی۔ سلطان میاں پانچ بچیاں چھوڑ کر اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ بیوہ عورت کی چھاتی پر پانچ سلوں کا بوجھ۔ جھانسے میں آ گئی۔ منجھلی خار کھائے بیٹھی تھیں۔ وہ اپنا کینڈی ڈیٹ بیاہ لائیں اب ہوتا یہ ہے کہ دو ایک کی طرف ہو جاتی تھیں۔ اور دوسری طرف بیچ میں بجر بٹو۔ یار شروع میں چار کا حکم ہے۔ اگر پانچ یا تین ہوتیں تو کچھ فیصلہ ہو

جاتا- مگر اس چارپائی نے تو چاروں اور سے گھیر کر مجھے مارنے کی قسم کھائی ہے-"

"معاف کیجئے گا میاں- یہ چوتھا نکاح آپ نے پندرہ برس کی لونڈیا سے کیا- یہ تھوڑی زیادتی ہو گئی-"

"ارے یار' کوئی مائی کا لال پندرہ برس کی لونڈیا سے انکار کر سکتا ہے میاں عورت مرد کی سب سے بڑی کمزوری ہے- میں نے کوئی ناجائز بات تو نہیں کی' اور پھر مجھے سالا کیا معلوم تھا کہ اس سبز قدم کے آتے ہی مجھے قبل از وقت ریٹائر ہونا پڑے گا-"

"پھر بھی سنئے چھوٹے میاں' ہاتھ تو آپ نے بڑا زبردست مارا تھا-"

"تو کیا سب میں اکیلا ہڑپ گیا؟ اور پھر مجھے کیا خبر تھی کہ نیا افریکا حرامی ہے اور مجھے پھانسنے کی تاک میں لگا ہوا ہے- بھول کس سے نہیں ہوتی میاں؟"

"سب نصیب کے پھیر ہیں-" مرزا نے ٹھنڈی سانس بھری اور دونوں نے نیت باندھ لی-

کم نصیب چھوٹی بیٹھی جھانوے سے ایڑی پر سے میل چھڑا رہی تھی- بڑی بیگم برآمدے میں بیٹھی سینی میں بڑیاں توڑ رہی تھی- منجھلی بیگم ادوائن کس رہی تھیں اور سنجھلی جھلنگے میں پڑی لمبی لمبی جماہیاں لے رہی تھی- رات چھوٹی کی باری تھی اور حسب معمول وہ چھوٹی کی کوٹھڑی کے بند کواڑوں کو دل ہی دل میں کوس رہی تھی- چھوٹی سچ مچ سبز قدم تھی- پہلی رات جب میاں نے اس کی کوٹھڑی میں قدم رکھا تو ان پر پہلی بار اختلاج کا دورہ پڑ گیا- اس دن سے میاں کچھ بجھے بجھے سے رہنے لگے تھے- ہفتوں میں کسی بیوی کی باری نہیں نمٹائی- مسجد میں سونے لگے تھے- حکیم صاحب نے ڈنڈ بیٹھک کو بھی منع فرما دیا تھا- بڑی تو اللہ والی بن چکی تھیں- ہر دم وظیفے پڑھا کرتی تھیں- انہوں نے شاید کوئی ایسا جناتی چلا کھینچا تھا کہ میاں کا دم درود ختم ہو گیا-

چھوٹی بیٹھی جھانوے سے کھیل رہی تھی- دنیا جانتی تھی کہ وہ کیوں ہر دم خلا میں تکا کرتی تھی اور بدبدا بدبدا کر اپنے جی سے باتیں کرتی تھی- مترانی آنگن میں

جھاڑو لگا رہی تھی- کچھ ڈری کچھ سہمی وہ بار بار بیگموں کی طرف دیکھ رہی تھی- جب وہ موری میں جھاڑنی لگا رہی تھی تو اس نے ادھر ادھر دیکھ کر جھپ سے ایک کاغذ کا گولا چھوٹی کی گود میں ڈال دیا اور بیری کے پیڑ کے نیچے پتے سمیٹنے لگی-

چھوٹی کے ہاتھ پاؤں سن ہو گئے' جیسے کسی نے بم کا گولا چھوٹی کی گود میں ڈال دیا ہو- کندھے سے دوپٹہ سرکا کر اس نے گود میں بھر لیا- اور پھر اس کے کان سرخ ہو گئے- بڑی چابک دستی سے اس نے کاغذ کا گولا گریبان میں اڑس لیا- پھر پانی کا لوٹا اٹھایا اور بڑی بے پروائی سے بیت الخلا میں گھس گئی-

بڑی نے منجھلی کی طرف دیکھ کر بڑے معنی خیز انداز میں سر ہلایا- وہ کھی کھی کرکے ہنس پڑی-

"شاکرہ بیگم کو آج پھر دست لگے!" انہوں نے منجھلی کو آنکھ ماری اور تسبیح کے دانے گھمانے لگی-

منجھلی نے ادوائن کو آخری جھٹکا دیا اور کمر پہ ہاتھ رکھ کر میدان میں ڈٹ گئی-

"جھوٹے بہتان لگانے والوں کی قبر میں کیڑے پڑیں گے-"

"اے کیڑے پڑیں گے جھوٹیوں کے-" منجھلی پھنکاری-

"معصوم کا صبر پڑے گا-"

"ان گنوں ایک آدھ خون ہو کر رہے گا- میاں کے کان میں بھنک پڑ گئی تو بس دیکھنے والے دیکھیں گے-" بڑی نے جائے نماز کا کونا پلٹ دیا-

شاکرہ نے اندر سڑتے' بدبو کے بھبکے اڑاتے پاخانے میں منہ میں آنچل ٹھونس لیا اور لرزتے ہاتھوں سے کاغذ کو گولا دبوچا' جیسے گولا پھٹ کر اس کے چیتھڑے اڑا دے گا- اس نے ذاکر میاں کو کتنا کتنا سمجھایا کہ اب وہ پرائی امانت ہے- اب ان کا خیال بھی جی میں لانا گناہ ہے- مگر ان کے سر پر تو جنون سوار تھا-

ذاکر حسین کی خالہ اس کی سگی پھوپھی تھیں- ہمیشہ اسے "میرے ذاکر کی بہن" کہا کرتی تھیں' مگر ذاکر تین سال تک دنیا بھر کی ٹھوکریں کھاتے رہے قسمت

کی بات تھی کہ ادھر شاکرہ کا نکاح ہوا۔ ادھر چھ مہینے کے اندر انہیں اسکول میں نوکری مل گئی۔ اگر وہ نکاح کے وقت موجود ہوتے تو عذر مچا دیتے لیکن وہ تو کسی انٹرویو کے لئے بھرت پور گئے ہوئے تھے۔ وہاں سے لوٹے تو شاکرہ پرائی ہو چکی تھی۔ بے چارے سر جھکا کر رہ گئے۔ پھر کسی شادی میں ان کی شاکرہ سے مڈبھیڑ ہو گئی وہ انہیں دیکھتے ہی جلدی سے پلٹ کر بھاگی اور بھیڑ میں گم ہو گئی۔ مگر شادی کے ہلڑ میں ڈھونڈنے والا ہی پالیتا ہے۔ شاکرہ جدھر مڑتی۔ ذاکر میاں کی آنکھیں اسے دبوچ لیتیں۔ مگر وہ تو اب بیاہتا تھی۔ شاکرہ نے کاغذ کا گولا منہ میں ٹھونس لیا۔ سسکیاں بھر بھر کر اسے پیس پیس کر لگدی بنائی۔ پھر موری میں تھوک کر اسے پانی سے بہا دیا۔ اس کے بعد اپنے آنسو پونچھے اور نکل کر مٹی سے ہاتھ پاک کرنے لگی۔

آوارہ لونڈوں کا ایک گچھا نیم کے پیڑ کے نیچے آکر گرا اور لاتوں گھونسوں کا ایک طوفان برپا ہو گیا۔

میرن میاں نے گالیوں کی ایک لمبی سی ڈوری بچوں کی ماں بہنوں کے حساب میں کھینچی اور سلیپر پکڑ کر گھمسان پر ٹوٹ پڑے۔ بچے پھر سے اڑ گئے۔ صرف ایک مرگھلا سا چوزہ ان کے ہاتھ آگیا۔ وہ اسی پر برس پڑے۔ غفورا دودھ والا تھوڑی دیر دم بخود دیکھتا رہا۔ پھر دوکان سے کود کر میرن میاں سے بھڑ گیا۔

"بناق کو کیوں مار رہے ہو جی؟" اس نے سلیپر چھین کر دور پھینکا۔

"تو کون ہوتا ہووے ہے!" میرن میاں گرجے۔ "یہ حرام زادہ بڑا عینی ہے ہٹ جاؤ غفورے، آج میں اس کی ہڈی پسلی ایک کردوں گا۔"

"پر کاہے کو؟"

"اس کی تو ماں......"

"زبان سنبھال کر میاں۔" غفور بکھرنے لگا۔

"زبان کے بچے! تو کون ہوتا ہے؟"

"میں کون ہوتا ہوں؟ یہ بھی اچھی کہی۔ ارے میں اس کا باپ ہوں۔"

"کیا بکتا ہوے؟ یہ سنجھلی کا پلا ہے اور......"

"ارے میاں یہ تو میرا فخرو ہے۔"

"تیرا فخرو؟ مگر......" میاں ڈھیلے پڑ گئے۔

"اپنے لونڈے کو بھی نہیں پہچانتے۔" لونڈا چھوٹ کے بھاگا۔

"ہت تیرے کی' بھائی میں سمجھا میرا ہے۔" میرن میاں ہانپتے ہوئے سیڑھیوں پر ڈھے گئے۔

"میاں' تم تو بالکل سٹھیا گئے ہو۔" مرزا اسٹور کھولتے ہوئے چلائے۔

میرن میاں گھٹنوں پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہے جیسے کوئی ان کی تصویر کھینچ رہا ہو۔ "قسمت نے اس بڑھاپے میں انتے کہاں لا کر پھینکا تھا۔ گھر کیا تھا۔ ایک بھیانک جنگل تھا۔ جس میں چار شیرنیاں ضروریات زندگی سے محروم غرایا کرتیں۔ خیر بڑی تو جائے نماز پر جا بیٹھی تھی۔ وہ کرتے کاڑھ کاڑھ کر ہانڈی چڑھا لیتی تھیں۔ چھوٹی انہیں ہمیشہ سوتی ہی ملی۔ انہیں اسے جگانے کی کبھی ہمت بھی نہیں ہوئی۔ اگرچہ وہ جانتے تھے کہ مکر کئے پڑی ہے اور ساری رات یونہی بند آنکھوں سے جاگ کر گزارے گی۔ کبھی جی چاہتا کہ کہہ دیں' چین ہے سو جا بد نصیب کہ جگانے کا خطرہ کبھی کا ختم ہو چکا ہے۔ اب اس جنم میں تو شب بیداری کا ڈر رہا نہیں مگر بیچ والیاں بڑی بے شرم تھیں۔ طعنوں تشنوں سے کلیجہ چھلنی کر دیتیں۔ وہ یہی سمجھتی تھیں کہ چھوٹی کے نصیب جاگ رہے ہیں۔

کیا غضب کی تنہا تھی۔ جب بڑی کو بیاہ کر لائے تھے تو زندگی کیسی بھری پری تھی۔ کم سن' دبلی پتلی دلہن ایک رس بھری کی طرح دل و دماغ کو معطر کر ڈالتی۔ آنکھوں میں رت جگے کا خمار دیکھ کراماں جلی کٹی سنانے لگتیں۔ باقی کی تین شادیاں گھسے میں آ کر کر تو ڈالیں۔ مگر وہ رس کسی میں نہ ملا اور چھوٹی نے زندگی میں زہر گھول دیا۔ جو عمر پوتے نواسے کھلانے کی تھی۔ وہ حکیم ڈاکٹروں کی ڈہلیز کی خاک لینے میں گزر رہی تھی۔

"طلاق! ہائے ذاکر بھائی کیا کہہ رہے ہو تم؟ ہمارے خاندان میں آج تک

کوئی طلاق نہیں ہوئی- اماں کا دم نکل جائے گا ویسے ہی کھاٹ سے لگ گئی ہیں-"
"میں انہیں سمجھا لوں گا شاکرہ-"
"تمہاری اماں تو حشر ہو جائے طلاقن سے بیاہ نہ کرنے دیں گی-"
"پھر دنیا کیا کہے گی؟"
"میں دنیا کو لات مار دوں گا- میری دنیا تو تم ہو شاکرہ-"
"تمہیں اللہ کا واسطہ ایسی باتیں نہ کہو- کسی کو خبر ہو گئی تو یاد رکھنا کچھ کھا کے سو رہوں گا-"
"تم اس وقت بھی میری ہی ہو گی- میں بھی تمہارے ہی پاس پہنچ جاؤں گا-"
"خدا نہ کرے جو تمہارے دشمنوں کو کچھ ہو' پھوپھی جان کے بڑھاپے کا ایک تم ہی تو سہارا ہو- اور پھر تمہاری بہنوں......"
"میں نے اپنی بہنوں کا ٹھیکہ نہیں لیا ہے- انہوں نے میرے لئے کیا کیا ہے؟ تم پرائی ہو گئیں' میرا حق چھن گیا اور------ وہ بیٹھی دیکھتی رہیں-"
"چھوٹی!" منجھلی کی آواز سن کر شاکرہ نے کھڑکی کے پٹ کھول دیئے-
"تیری موت آئی ہے حرامزادی-" منجھلی نے شاکرہ کی کنپٹی پر وہ زناٹے کا تھپڑا جڑا کہ اس کا سر دیوار سے جا ٹکرایا- "میاں کو پتہ چل گیا- نامراد تو ناک چوٹی کاٹ کر ہتھیلی پر دھر دیویں گے-"
منجھلی آواز دبا کر بول رہی تھی- اس خیال سے کہ بڑی نے سن لیا تو غضب ہو جائے گا-
شاکرہ چپ گرم گرم آنسو بہاتی رہی-
پورا ہفتہ ہونے کو آ رہا تھا- میرن میاں اپنی چارپائی سے بدن تڑائے مسجد میں ڈیرہ ڈالے بیٹھے تھے- کرتہ اور تہمد چیکٹ ہو گیا تھا' مگر انہیں ہوش نہ تھا- بیگمیں بار بار لونڈوں کو بھیج رہی تھیں- مگر میاں روٹھے بیٹھے تھے- مسجد میں کوئی بھوکا نہیں مرتا- روز ادھر ادھر سے کھانا آ جاتا تھا- کبھی مرزا کے ہاں جا کر کھا

لیتے- کبھی رجو حلوائی کے دوکان سے حلوا پوری خرید لیتے-

یہ خانہ بدوشی کی زندگی انہیں بڑی راس آ رہی تھی مگر رکمنی بائی شہر سے ایک نیا مال پھانس کر لائی تھی- اس کے ہاں مجرا تھا- آج حساب* سے چھوٹی کی باری پڑتی تھی- ایسی کی تیسی ان باریوں کی، وہ انسان تھے- کہ تماشا! پہلے بھی کئی دفعہ روٹھ کر چلے آئے تھے- پھر خود ہی* من گئے تھے- کپڑے بدلنے کے لئے منا ہی پڑے گا-

ایک دم ان کے پیروں میں جیسے اژدھا لپٹ گیا- مٹی کا تھوا بنے وہ کھڑے کے کھڑے رہ گئے- سامنے کھڑکی میں بائیسکوپ چل رہا تھا- سلاخوں سے آدمی تو نہیں گزر سکتا- مگر پرشوق ہاتھ* اور ہونٹ روکے نہیں رکتے- شاکرہ کو ذاکر میاں بھینچے نہ جانے کس دنیا میں کھوئے ہوئے تھے- میرن میاں کو ایسا لگا جیسے سارے جسم کا خون سمٹ کر آنکھوں میں اتر آیا ہو- اسی لمحہ شاکرہ نے آنکھیں کھولیں- ایک گھٹی ہوئی چیخ اس کے منہ سے نکلی اور کھڑکی کے پٹ بند ہو گئے-

اس سے پہلے کہ ذاکر میاں مڑ کر دیکھتے، میرن میاں جھٹ ایک گلی میں سرک گئے- گلی سنسان پڑی تھی- میرن میاں تیزی سے نکل کر چوک میں آ گئے- انہیں کچھ ہوش نہ تھا- لوگ انہیں دھکا دیتے گزر جاتے- مگر انہیں تو خبر ہی نہ تھی کہ کون ہیں، کہاں ہیں- انہوں نے اڑتی اڑتی خبر تو سنی تھی، مگر یہ نہیں معلوم تھا کہ معاملہ ان حدوں کو چھو رہا ہے- منجھلی کئی بار رابعہ کے لئے ذاکر حسین کا ذکر بیشک کر چکی تھی- لڑکا ہونہار تھا- یہ پتہ نہ تھا کہ ادھر پھنسا ہوا ہے-

چلتے چلتے تھک گئے تو منڈیر پر بیٹھ گئے- نہ جانے کب تک بیٹھے رہے- مغرب کی اذان ہوئی تو انہیں ہوش آیا- اذان کی آواز پر ان کے قدم خود بخود مسجد کی طرف اٹھنے لگے- نماز کے بعد وہ دیر تک کچھ پڑھتے رہے-

"رکمنی کے ہاں چلئے گا؟" مرزا نے پوچھا-

"تم چلو، ہم ابھی آتے ہیں- ہم بھی آج وہ مجرا ضرور دیکھیں گے- نئی چھوکری ہے- نہ جانے کون ہے- کسی کی بیٹی، کسی کی بہن اور بہت ممکن ہے کسی

کی بیوی ہو-" یہ کہہ کر وہ استغفار پڑھنے لگے-

رکمنی کے کوٹھے سے دھوم دھاکی صدائیں آ رہی تھیں، مگر میرن میاں اپنے گھر کی طرف چلتے رہے- کورا کرتا اور تہمد نکال کر وہ نل پر خوب مل مل کر نہائے جیسے آج وہ کوئی اہم ترین فرض ادا کرنے جا رہے ہوں- انہوں نے طاق سے خس کے عطر کی شیشی اٹھا کر آدھی ہتھیلی پر انڈیل لی- دونوں ہاتھ مل کر شانوں کو لگائے، پھر داڑھی پر پھیر لئے-

یوں بن سنور کر وہ چھوٹی کی کوٹھڑی میں پہنچے-

چھوٹی حسب عادت مکر گانٹھے مردہ بنی پڑی تھی- میرن میاں مونچھوں ہی مونچھوں میں مسکرائے-

"شاکرہ بی-" انہوں نے گلا صاف کر کے دھیمے سے پکارا- "آج مکر گانٹھنے سے کام نہ چلے گا، بی بی شاکرہ! سنو لڑکی، آج سے تم مجھ پر حرام ہوئیں- میں نے تمہیں طلاق دی- طلاق------ طلاق-"

مگر شاکرہ ٹس سے مس نہ ہوئی- ویسے ہی کروٹ سے پڑی رہی-

"شاکرہ بی-" میرن میاں نے ذرا زور سے پکارا-

جواب ندارد!

میرن میاں کچھ چڑ گئے- اس کا شانہ اٹھ کر ہلایا-

"شاکرہ بی!"

شاکرہ بی کی گردن ڈھلک گئی-

جھک کر میرن میاں نے مالش کی- زہریلی دوا کی خالی شیشی تکیہ کے پاس سے اٹھائی اور چپ چاپ پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گئے-

قبرستان میں جنازہ جب تازہ کھدی ہوئی قبر سے دس قدم کے فاصلے پر رہ گیا تو میاں میرن کو ذاکر میاں نظر آ گئے- ان کی آنکھیں خون کبوتر کی طرح سرخ ہو رہی تھیں- میرن میاں نے پلنگ کا پایا نہیں تھما دیا اور ان کی امانت ان کے سپرد کر کے الگ ہو گئے-

جھری میں سے

ہے تو یہ بڑی معیوب سی بات۔ مگر میں چھپ کر بہت سی معیوب باتیں کر لیتی ہوں۔ لہٰذا اسی اصول کی بناء پر میں دروازے کی باریک سی جھری میں سے اکثر جھانکا کرتی ہوں۔

"یہ بہت ذلیل حرکت ہے۔"

لوگ کہتے ہیں۔

"بھئی دل جو گھبراتا ہے میرا۔۔۔۔۔" میں جواب دیتی ہوں۔

میرے معقول جواب عموماً" لوگوں کو قائل کر دیا کرتے لہٰذا میں باخوف خدا جھری میں سے جھانکتی ہوں اور انشاء اللہ جھانکتی رہوں گی۔۔۔۔۔ کون جانتا ہے۔۔۔۔۔!

تو میں پلنگ پر اوندھی پڑ جاتی ہوں پیٹ کے نیچے ایک تکیہ دبائے پڑی جھانکا کرتی ہوں۔۔۔۔۔!

یہ نہ سمجھیے گا کہ میں کسی نئے بیاہے جوڑے کو جھانکنے کے لئے اس دلچسپ جھری کو استعمال کرتی ہوں۔۔۔۔۔ معاف کیجئے گا۔۔۔۔۔ میں اتنی گری پڑی نہیں۔ اور نہ میرے پڑوسی اس قسم کی بدعنوانی کے قائل۔۔۔۔۔ بس تو پھر کیا اعتراض ہو سکتا ہے آپ کو۔۔۔۔۔!

اس بے حقیقت جھری سے جام جم کا کام لیا جا سکتا ہے ہمارے گھر کی جھریاں معمولی جھریاں نہیں۔۔۔۔۔ یہ دیدہ دانستہ بڑی کاوشوں سے عمارت میں خصوصیات پیدا کرنے کے لئے بنائی گئی ہیں۔۔۔۔۔ اگر آپ کو یقین نہ ہو تو ہمارے

کمرے کے پاس اور بھی کمرے خالی ہیں----- مگر کرائے پر----- آپ ان میں سے ایک کمرہ لے لیں میرا مطلب ہے کرائے پر----- اور مزے سے جھریوں میں سے جھانکیں۔

عمارت بہت اچھی ہے۔ صرف ایک بات ہے کہ خواہ کسی وقت آپ کسی کمرے کے کسی کونے میں ہوں۔ سورج کی کرنیں نئے نئے زاویوں سے آپ کے جسم کو ابالنے کی کوشش کرتی ہیں نیز جب آپ صبح اٹھیں گے تو ہلکا ہلکا سر میں درد' منہ کا مزا خراب اور بخار کے بعد کی سی تھکن محسوس ہو گی۔

ناشتہ پر آپ کو دبی دبی ابکائیاں آئیں گی اور پڑوسی عجیب و غریب اشیاء بگھاریں گے۔ جن میں سے پرانے جوتوں کے ابلنے کی سی سڑاند آئے گی۔ آپ دروازے مقفل کر لیں----- مگر درازیں-----! درازیں تو قائم رہیں گی۔

"ہاں تو میں ان ہی درازوں میں سے ایک دراز سے جھانکا کرتی ہوں اللہ کیا کیا تیری قدرت کے کرشمے ہیں----- سامنے ہی ایک کرسی کا پچھلا حصہ نظر آتا ہے جس پر ایک چوڑی سی تنبو کی شکل کی پتلون ہوا خوری کیا کرتی ہے۔

کبھی کبھی سفید اور کبھی بھوری اور سرمئی گویا یہ پتلون کرسی ہی کے استعمال کے لئے ہی بنی ہے اس کی پشت کے نچلے حصے پر دو سموسوں کی ہی شکل کے مثلث چپکے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے پتلون کی شکل پر کرب کی سی حالت طاری رہتی ہے۔

اس کرسی سے ذرا ہٹ کر ایک پلنگ کا پایا نظر آتا ہے اس پائے پر ایک عظیم الشان پیر کی ہیبت ناک ایڑی رکھی رہتی ہے اس ایڑی کو دیکھ کر مجھے ریگستانی علاقوں کی مہیب چٹانیں یاد آجاتی ہیں اس میں گہری گہری قاشیں ہیں۔

جن میں پسینے کی ندیاں بہہ بہہ کر پائے کو سیراب کرتی ہیں اور جب مکھیوں سے تنگ آکر یہ ایڑی اپنے محور پر گھومتی ہے تو بالکل ایک چھوٹا موٹا سا زلزلہ آجاتا ہے پلنگ چنگھاڑتا اور پایا جھوم جاتا ہے۔

کم بخت دراز اتنی چھوٹی ہے کہ اور کچھ نظر نہیں آتا۔ اتنی دیر بھلا کون اوندھا لیٹ سکتا ہے----- پیٹ کی نسیں اکڑ کر بانیٹے پڑنے لگتے ہیں اور میں

کروٹ سے لیٹ کر کہنی کے نیچے تکیہ سرکالیتی ہوں گردن کو تھوڑا مروڑتی ہوں اور ٹھوڑی میں ہاتھ کی ٹیکن لگالیتی ہوں۔

کمرے کی دنیا انگڑائی لیتی اور دو دھاری دار مسکین سی ٹانگیں دکھائی دیتی ہیں------ ان ٹانگوں کو دیکھ کر آپ کے سارے مادرانہ جذبات کھول اٹھتے ہیں۔ بے اختیار جی چاہتا ہے چپکے سے ان نیم خفتہ ٹانگوں کو لٹا دیں اور آنسو بھری آنکھوں سے بیٹھے تکا کریں جب بہت ہی دل بے قابو ہو تو خدا کی ہزاروں نعمتوں کو خیال میں لائیں اور ایک آہ بھر کر صبر کریں۔

ان پیروں کے سوراخ میں دو سفید اور شاعرانہ پیر مڑے ہوئے ہیں جو چنبیلی کی بڑی بڑی نیم شگفتہ کلیوں سے مشابہہ ہیں۔ اور جن پر کنول جیسی باریک سرخ نسوں کا جال بچھا ہوا ہے۔

ان ٹانگوں کے گھٹنوں پر ایک مجبور سا ہاتھ ٹہلا کرتا ہے۔ دبے پاؤں------ ڈرپوک عاشق کی طرح کانپتا------ لرزتا------ جھجکتا------ کبھی انگلیاں ہتھیلی سے چوٹ جاتی ہیں اور کبھی گھٹنے کی چپنی کو بھینچتی ہیں۔ ایک پراسرار قبرستانی سسکی ہوا میں لرزتی ہے۔

"ہلو------ ہلو------ مس رمولا------"

فضا یخ بستہ ہو جاتی ہے۔ دبی دبی آہیں اور مجروح کراہٹیں نون غنہ میں لپٹی ہوئی کمرے کی بالائی فضا میں بھٹکی ہوئی روحوں کی طرح تیرنے لگتی ہیں۔

گلا رندھ جاتا ہے۔ ہچکی روک کر جسم کو دوسرے زاویہ میں کھینچتی ہوں۔ اب میرا زریں حصہ جسم جل مچھلی کی طرح خمدار ہو جاتا ہے۔ اور بالائی حصہ پیڑ کے گدے کی طرح اکڑ جاتا ہے۔

یہ زندگی میں سب سے کٹھن بیٹھک ہے اور بڑے سے بڑے گیانی سادھو بھی نہیں سہہ سکے۔ مگر میں سہتی ہوں------ درار میں سے جھانکنے کے لئے انسان کو بھی کچھ سہنا پڑتا ہے۔ اور اب سامنے اسٹول پر ریڈیو رکھا ہوتا ہے اس ریڈیو کو شائد آپ کی ساری ذہنی بیماریوں کا علم ہے کیونکہ عام طور پر تو بازار کے

بھاؤ سنا سنا کر آپ کو دہلاتا ہے! پھر گھسے ہوئے ریکارڈ ماتم شروع کر دیتے ہیں----- خیر! تو اس کے پاس ہی ایک چھوٹی سی کھانے کی میز ہے جس پر سفید چادر پڑی رہتی ہے۔

یہ میز بالکل بے ہودہ دلہن کی طرح اداس اور شرمیلی معلوم ہوتی ہے اس کے ارد گرد ٹیڑھی شکلوں کی ہونق کرسیاں کھڑی رہتی ہیں ان کی ہیئت سے بدحواسی اور سراسیمگی بھی ظاہر ہوتی ہوے اور کچھ مدقوق اور متحیر سی لگتی ہیں یہ نہیں کہ ان کے اوپر روغن نہیں یا لکڑی گھنی ہوئی ہے۔ نہیں----- بس یہ تو درار میں سے کچھ عجیب سی نظر آتی ہیں۔

میز سے ذرا ہٹ کر ایک لمبا اور پتلا سا اسٹول رکھا ہے جس پر دو فٹ اونچا رسالوں اور اخباروں کا منارہ سا چنا ہوا ہے یہ اسٹول بالکل قحط زدہ مزدور معلوم ہوتا ہے جو سرمایہ دار کی وزنی دولت کے نیچے دبا جا رہا ہو۔ اگر آپ تھوڑی دیر اس اسٹول کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھیں تو ایسا معلوم ہو گا کہ اب اپنی جگہ سے ہل کر بھاگا اور اب بھاگا!

بائیں طرف-----!

الماریوں کی قطاریں ہیں جن میں عطار کی دوکان میں بجی ہوئی بوتلوں کی طرح منوں کتابیں رکھی ہیں۔ کڑوی کڑوی دواؤں کی شکل کی لمبوتری کتابیں۔

اگر آپ ذرا بھی نفیس مزاج ہیں تو آپ کو بڑے زور کی پھریری آئے گی-----

ایک الماری کے بالائی تختے پر ایک گھڑی رکھی ہے چھوٹی سی موٹی عورت کے چہرے کی مانند کڑک مرغی کی طرح کٹاک کٹاک کرتی رہتی ہے۔ یہ گھڑی اس مکان میں بالکل مالکہ مکان کی حیثیت رکھتی ہے جوں ہی دس بجتے ہیں۔ گائے سینگ بدلتی ہے۔ نظام فلکی میں تبدیلی ہوتی ہے کرسی کا پتلون ایک سپاٹے سے غائب ہو جاتا ہے۔

پائے پر رکھی ہوئی پسینہ دار بھوری ایڑی بھد سے زمین پر آن پڑتی ہے۔

کپڑوں کی جھٹک پٹک سنائی دیتی ہے------ گویا فرشتے پھڑپھڑا رہے ہوں پھر زمین پر جوتیاں رینگنی شروع ہوتی ہیں------ معلوم ہوتا ہے پوری باٹا کمپنی کے جوتے پڑے مچل رہے ہوں جوتوں کی گھس گھس سے آپ کے دانت کسکسا اٹھتے۔ جیسے ان کے درمیان کوئی ریت کی چٹکیاں چھڑک رہی رہا ہو------!

"ہلو------ ہلو مس رمولا------؟" ایک افسردہ غنودگی میں ڈوب جاتی ہے------ حیرت زدہ کرسیوں پر غیر مرئی صورتیں نظر آنے لگیں گی اور آپ کو پیٹھ پر ٹھنڈی ٹھنڈی انگلیاں رینگتی محسوس ہوں گی۔

ان میں سے ایک صورت تو بالکل تھمے ہوئے طوفان سے مشابہ ہے جیسے بادل امنڈ گھمنڈ کر آئیں اور دنیا کے گنہ گاروں سے روٹھ کر وہیں تنے کے تنے رہیں۔ اور اظہار نفرت میں زخمی شیروں کی طرح غرائیں۔

اس شکل کو دیکھ کر آپ کے دل میں بڑے بڑے آتش فشاں پہاڑوں اور خاموش تنوروں کا خیال آ جائے گا۔ جہاں پھٹنے سے لاوا کھول کرتا ہے اور ہیبت ناک دیو کی طرح ڈکاریں مارتا ہے۔ جیسے کسی جن کو ناخن برابر ڈبیہ میں بند کر دیا ہو۔ آپ کا دل بغاوت پر آمادہ ہو گا۔ دوسری شکل دیکھتے ہی آپ کا دل کسی سے لپٹ رو کر دل کی بھڑاس نکالنے کو چاہنے لگے گا۔ آپ کو فوراً یتیم خانوں کی بدانتظامی پر طیش آئے گا اور پھر آپ فلک کج رفتار کو بدعائیں دیں گے۔

غمگین اور دل دکھانے والے واقعات یاد آئیں گے------ دکھ سکھ امیری غریبی بیماری اور تندرستی کا مقابلہ کرنے کو جی چاہے گا۔ اور آپ کا یہ بھی دل چاہے گا کہ دنیا کی ساری بڑی بڑی عمارتیں مسمار ہو جائیں------ سڑکیں کھد جائیں------ کلب ڈھے پڑیں------ قہوہ خانوں میں آگ لگ جائے اور سارے خوش لوگ کیچڑ میں پھسل پڑیں۔

اگر آپ بہت ہی زیادہ رقیق القلب ہیں۔ اور میری طرح غموں کو ہنس ہنس کر برداشت کرنے کے عادی ہیں تو پھر آپ ایک اور شکل دیکھنے کے لئے زندہ رہیں گے۔ چھینک آنے سے پہلے جو آثار ہوتے ہیں وہ اس پر مستقل طور پر چھائے

رہیں گے - آپ سارے وقت یہی محسوس کریں گے کہ اب چھینک آئی اور اب آپ کے اوپر نزع کی سی کیفیت طاری ہو گئی ہے اس سے نجات ملی مگر توبہ کیجئے! یہ شکل چھینک کر نہ دبے گی- آپ کو اوندھے لیٹے پیٹ میں بانٹنے پڑیں گے-
اور پھر درد قولنج کا مزا آنے لگے گا----- مگر وہ امر چھینک اسی طرح چہرہ پر تلی رہے گی!

اور پھر کبھی کبھی ایک اور شکل بھی آپ کو نظر آئے گی----- ایک دم سے آپ کو تازہ تازہ انسانی خون کی بو آئے گی اور پھر ایک نیم مقتول شکل نزع کی آخری منزلوں میں آخری قدم اٹھاتی نظر آئے گی دنیا بھر کے ہولناک قتل اور اقدام قتل کے واقعات یاد آ جائیں گے- اس مقتول و مظلوم صورت سے صاف ظاہر ہو گا کہ وہ اپنے قاتل کی تلاش میں آئی ہے مشتبہ نظریں پوچھیں گی-
"شائد تم نے ہی تو مجھے قتل نہیں کیا-----؟ اور آپ کو فوراً سارا قتل کا الزام خود اپنے اوپر جمتا نظر آئے گا-"

"اوہ معبود-----!

ہاں ایک بات ہو گی----- وہ یہ کہ وہ پائے والی ہیبت ناک ایڑی آپ اس صورت کے سر نہیں تھوپ سکتے- اب آپ کے دل کی دھڑکن غیر مطمئن ہو جائے گی بلاوجہ آپ کو بے بات کا پچھتاوا شروع ہو جائے گا- پھر معلوم ہو گا- کمرے میں روحوں کی کانفرنس ہو رہی ہے- اور وہ سب کی سب مل کر زندہ لوگوں کے خلاف سازشیں کر رہی ہیں- غمزدہ گیت اور غزلیں یاد آنے لگیں ہلکا ہلکا المناک نغمہ فضا میں لہرائے گا- جیسے قبرستان میں مردوں کے کفن سرسرا رہے ہیں بے رنگ و بو خون کے چھینٹے ہوا میں گھل مل جائیں گے- آپ کو اپنے سارے مردہ رشتہ دار اپنے ارد گرد کراہتے لرزتے محسوس ہوں گے- اور بیساختہ مقدس الفاظ لبوں پر منڈلانے لگیں گے- اور پھر آپ سنیں گے- میرے لئے جہاں میں----- چین ہے نا----- قرار اور دل میں ایک ہوک اٹھے گی- آنکھوں میں آنسو بھر آئیں گے- نیچے کا ہونٹ لرزے گا- چہرے کی باقی ماندہ نسیں مختلف سمتوں میں کھنچنے

لگیں گی۔ گلے میں کونین کی گولیاں اٹکیں گی دبی ہوئی سسکیاں ابھرتی ہوئی محسوس ہوں گی۔ جنہیں دبانے کے لئے آپ کو مجبوراً جھری کے پاس سے ہٹنا ہو گا۔ وہی ننھی سی بے حقیقت جھری میں سے اکثر جھانکا کرتی ہوں۔
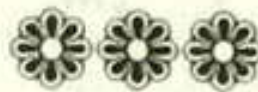
گیندا

"جنے یہ جھونپڑی ہے۔ ہے نا!" میں نے اور گیندا نے با لکمیری کی گھن دار جھاڑی کے نیچے رینگتے ہوئے تصور کیا اور ہم دونوں جھکے جھکے دونوں ہاتھوں سے زمین صاف کرنے لگے۔ ذرا سی دیر میں پیلی پیلی مٹی کے صاف اور چکنے فرش پر ہم نہایت بے تکلفی سے بیٹھے ہوئے تھے۔ ذرا سوچ بچار کے بعد ہم اپنا مرغوب ترین کھیل دلہن دلہن، کھیلنے لگے۔ گیندا نے اپنی بدبو دار سرخ اڑھنی کا لمبا سا گھونگھٹ مار لیا اور گڑی مڑی ہو کر بیٹھ گئی۔ میں نے آہستہ سے گھونگٹ اٹھا کر "دلہن" کا منہ دیکھا۔ گیندا کا گول مٹول چہرہ خون کے ایک دم دوڑ جانے کی وجہ سے بیر بہوٹی کی طرح لال ہو رہا تھا۔ آنکھوں کے پپوٹے بے چینی سے پھڑپھڑا رہے تھے اور وہ بمشکل اپنی ہنسی کو دبائے ہوئے تھی۔

اب ہم----- گیندا۔ بھئی اب ہم" میں نے رشک سے تڑپ کر کہا۔

"اہا!" بھیا نے ٹہنیاں ہٹا کر، ہمیں دیکھتے ہوئے کہا۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟"

گیندا نے ہڑبڑا کر گھونگھٹ پھینک دیا اور سہم کر بیٹھ گئی۔ ہمارے دل دھک دھک کرنے لگے۔

بھیا کیا کسی کو بھی معلوم ہو جاتا کہ ہم "دلہن" کا کھیل کھیل رہے تھے تو یقیناً" ہم پر مار پڑتی۔ یہ پر شوق کھیل تو ہم ہمیشہ چھپ کر ہی کھیلا کرتے تھے۔ نہ جانے کیوں؟

"آں--- آں"----- میں نے اٹھا کر کہا۔ "ہم تو کھیل رہے ہیں"

بھیا شاید نیکی کے دم میں تھے کہ جھکتے ہوئے خود بھی اندر آگئے اور اکڑوں بیٹھ گئے۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں وہ گھبرا گئے۔

"اوں ہوں" کمبختو یہاں کیسے بیٹھی ہو؟" انہوں نے ایک ٹہنی سے اپنی ناک بچا کر کہا۔

"اور گیندا" انہوں نے اس کے پھولے ہوئے گال میں چٹکی لے کر کہا "اور تو یہاں بیٹھی ہے۔ کہتا ہوں ننھا سے"

گیندا نے اپنی بڑی بڑی بھوری آنکھیں پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا۔

"ارے باپ رے' اور وہ اپنا مختصر سا لہنگا سنبھال کر بھاگنے لگی۔

"آں---- گیندا تو مت جا" میں نے پکڑ کر مچلتے ہوئے کہا۔

دادا مارے گا پھر" اس نے بھیا سے ڈرتے ہوئے کہا۔

"نہیں مارے گا تو نے کام تو کرلیا۔"

"اچھا بیٹھ" بھیا نے نرمی سے گیندا کو اپنے پاس گھسیٹتے ہوئے کہا۔ مگر بی تجھے تو ضرور پٹواؤں گا۔ یہاں زمین میں لوٹ لوٹ کر کپڑے گندے کر رہی ہے"

کہہ دینا' کہہ دینا۔ میں کوئی ڈرتی ہوں" میں نے ڈر کر کہا اور کپڑے جھاڑنے لگی۔!

"گیندا---- اری او گیندیا---- آ---- کدھر مر گئی۔" بہو کی آواز گونجی اور گیندا بھیا سے ہاتھ چھڑا کر تیر کی طرح بھاگی۔

آن کی آن میں کھیل بگڑ گیا۔ میں بھیا سے الجھ پڑی اور کرتی بھی کیا۔

"اِیں---- ں---- جاؤ یہاں سے" میں نے منمنا کر کہا۔

"بھتنی" انہوں نے گھٹی ہوئی آواز میں دانت پیس کر کہا۔ اور ایک دھپ میرے لگا کر چل دیئے۔

2

"بدھوا کاہے کو سنگھار کرے" گیندا نے فلسفیانہ انداز سے کہا۔

"بدھوا!" میں نے سرخ اینٹ کو جسے میں سیندر تیار کرنے کے لئے پتھر پر گھس رہی تھی۔ کرتے سے پونچھ کر کہا "بدھوا!"

"ہاں' اور کیا' ہم بدھوا ہیں" مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے گیندن نے فخریہ کہا۔

"اور ہم؟" میں نے حرص کی۔

"تم" وہ حقارت سے منہ بنانے لگی "تم تو کنیا ہو۔ ہی۔۔۔ ہی۔۔۔۔ ہی" اس نے مذاق اڑایا۔

میرا دل بیٹھ گیا۔ گیندا مجھے ہمیشہ حقیر سمجھتی ہے۔ میں، مجال ہے جو اس کی برابری کر جاؤں پچھلے بیساکھ میں اس کا بیاہ ہوا۔ سرخ سرخ کپڑے پہنائے گئے، چمکتے ہوئے چاندی کے زیور بلا شرکت غیرے اس کی ملکیت ہوگئے اور وہ کئی دن تک چھم چھم کرتی اٹھلائی پھری۔ میں بے چاری کسی شمار و قطار ہی میں نہیں۔ ٹکر ٹکر منہ دیکھنا اور حرصیائی بلی کی طرح اس کے پیچھے لگے رہنا۔ کبھی اس کی چوڑیاں گنتی۔ کبھی اس کے گھونگرو سنبھالتی، کبھی اس کا جھوٹے گوٹے کا دوپٹہ زمین سے لگ جانے پر تڑپ کر اٹھالیتی۔ اماں کی زیادتی دیکھو اگر میں ذرا لحاف کا بھی گھونگھٹ نکال کر بیٹھوں تو ڈانٹ بتاتی ہیں۔ او نہ۔ آخر کیوں؟"

"کیوں بچھونے کھوند رہی ہے؟" جیسے لحاف گھونگھٹ کے استعمال سے پھٹ ہی تو جائے گا نا۔

جو کبھی دوپٹیاں اوڑھنے کو مانگوں تو جھڑک دیتی ہیں۔

"نہیں۔ کیچڑ میں لتھڑنے کو نا!"

یہ مانا کہ میں گیندا سے چھوٹی ہوں، مگر اتنی ننھی بھی نہیں کہ دلہن نہ بن سکوں۔ مجھ سے کہو ساری عمر گھونگھٹ کاڑھے بیٹھی رہوں اور ذرا بھی جی نہ گھبرائے۔ آخر میں بھی تو انسان ہوں۔ گیندا کا میاں برسات میں مر گیا۔ سارا گھر دن رات روتا پیٹتا رہا۔ گیندا کی تو چوڑیاں توڑ دی گئیں اور وہ بھی خوب روئی "ہا۔ بچاری گیندا" سب اس کو سمجھتے بجھاتے اور پیار کرتے اور میرا تو گھر میں کوئی نوٹس بھی نہ لیتا۔ ہر بات میں یہی کہ بس ابھی بچہ ہوں، ابھی چھوٹی ہوں۔ خاک پڑے اس چھوٹے پن کو۔ آخر کب تک چھوٹی رہوں گی؟ اتنی تو بڑی ہوگئی کہ نیلی شلوار بھی اونچی ہوگئی۔ اچھی اچھی چیزوں کے لئے تو میں "ڈھونگڑی" ہوجاتی ہوں اور ویسے مطلب کے وقت مجھے سب چھوٹا بنا دیتے ہیں۔ یہ اب تک مجھے نہیں معلوم کہ چھوٹی ہوں یا بڑی۔ کچھ عجب الجھن ہے۔ او نہ!

"تو تم سنگھار نہیں کرتیں؟" میں نے بے کار دوہرایا۔

"جب پتی ہی مرجائے تو پھر "کس پر" سنگھار کریں" گیندا نے صوفیانہ لہجہ اختیار کرلیا۔ مانگ کا سیندور ہاتھ کی چوڑی پتی کے لئے ہی ہوتی ہے نا؟" اس نے سنی سنائی بات کو یقین کا رنگ دینے کی کوشش کی۔

"دیکھ گیندا کتنا ڈھیر سا سیندور بن گیا" میں نے پسی ہوئی اینٹ کو انگلیوں سے سمیٹتے ہوئے کہا۔

گیندا سیندور کی چھوٹی سی ڈھیری کو ایک مکمل بیوہ کی طرح دیکھنے لگی۔ لیکن جلد ہی ہم دونوں مسکرانے لگے۔

"تو بھائی سے نہ کہنا---- اچھا------ آؤ" اس نے آگے سرک کر کہا اور ہم دونوں سنگھار کے لئے تیار ہوگئے میں نے ایک تجربہ کار مشاطہ کی طرح گیندا کے الجھے ہوئے بالوں کو بمشکل پانی سے چپکایا اور اس میں سیندور بھر دیا۔ آہا۔

گیندا کا چہرہ لال لال ہوگیا اور اس نے شرما کر منہ اوڑھنی میں چھپا لیا اور ہنستے ہنستے لوٹ گئی۔

"ارے ارے" میں نے اسے تنبیہہ کی "سب بگڑ جائے گا۔ بھئی ہم نہیں۔"

"لاؤ اب تمہارے لگاؤں" گیندا نے میرے سر پر پانی چپڑ کر کہا۔

"اور بندی؟" میں نے آنکھیں جھپکا کر کہا۔

"ہاں----ں ---- اور کیا۔" اس نے اطمینان دلایا۔

ایک ذرا سی دیر میں ہم دونوں سیندور سے مانگ بھر اور بندیاں لگا سر پر اوڑھنیاں منڈھ کر سلیقے سے ایک کونے میں بیٹھ گئے اور ایک دوسرے کا منہ دیکھ دیکھ کر اپنے حسن کا اندازہ لگا کر شرمانا ہی پڑا۔

سامنے سے بھیا نظر آئے اور گیندا سرخ ہوگئی ہم نے جلدی جلدی ماتھے کی بندیاں چھٹا ڈالیں اور کھسیانی ہنسی ہنسنے لگے۔

بھیا مجھے دھکیل کر گیندا کے پاس بیٹھ گئے وہ شرمانے لگی۔ بھیا نے دانت

پیس کر اس کے دونوں گالوں میں چٹکی لی اور وہ اوں 'اوں' کر کے سکڑ گئی۔
"اے ہے۔ یہ کیا ہے؟" بھیا نے نفرت سے پسی ہوئی اینٹ کی ڈھیری کو جوتے سے بکھیر کر کہا ان کی اجلی قمیض بھی خراب ہو گئی وہ اسی پر چڑھ بیٹھے تھے۔
"یہ تو سیندور ہے۔ ہم نے بنایا ہے۔" میں نے فخریہ کہا۔
بھیا انگلی سے سیندور سے کھیلنے لگے اور اپنے پیر سے گیندا کا پیر دبایا۔
"لا میں تیرے لگاؤں" بھیا نے سیندور لے کر گیندا کے لگا دیا۔
"اوں" اور اس نے ہتھیلی سے سیندور چھٹا دیا۔
"بھیا۔ گیندا تو بدھوا ہے وہ سیندور کب لگاتی ہے" میں نے اپنی قابلیت جتائی۔
"لگائے گی کیسے نہیں چڑیل" اور انہوں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اسے پیچھے دھکیلا۔(اس نے اپنا منہ چھپا لیا۔
"گیندا' پھر میں تجھ سے بولوں گا بھی نہیں۔" اور گیندا نے آخر کو منہ کھول ہی دیا۔
"گیندا" بھیا نے اس کے قریب سرک کر کہا "بیاہ کرے گی؟"
"ہٹ" اور وہ شرما گئی۔
میں بھی حرص میں شرمانے کی کوشش کرنے لگی۔ ہم دونوں گھنٹوں بیاہ کی باتیں کر کے شرمایا کرتے تھے۔ بھیا کو تو وہ باتیں معلوم بھی نہ ہوں گی جو ہم نے آپا اور ننھی کو کرتے ہوئے پلنگ کے نیچے چھپ کر سنی تھیں۔
ہٹ کیسی!" بھیا نے کہنی کا ٹھوکا دے کر کہا۔ "بول کرے گی بیاہ!"
بھو کے چھڑوں کی جھنکار سے ہم تینوں چونک پڑے۔ وہ کنوئیں پر آ رہی تھی۔
"گیندا!" اس نے پکارا اور دوسرے لمحے ہمارے سروں پر آ گئی۔
"ارے رانڈ' یہاں بیٹھی ہے۔ چل استری دھکا" وہ غرائی۔
گیندا جلدی سے کترا کر جانے لگی۔ مگر اس نے لپک کر اسے جا لیا اور بال

پکڑ کر دو جھٹکے دیئے۔

"اور یہ مانگ چوٹی تو نے کیسی کری ہے؟" اس نے دھول مار کر کہا۔ گیندا غوطہ مار کر نکل گئی۔ میں اور بھیا تڑپ اٹھے۔

بھو سے تو میرے بدن میں آگ لگی تھی۔ وہ جب گیندا کو مارتی میں ضرور کچھ نہ کچھ اس کا نقصان کر دیتی۔ آج بھی جیسے ہی اس کی آنکھ بچی میں نے مٹھی بھر کے راکھ اس کے صاف ستھرے کلف میں جھونک دی اور بھیا نے شام کو کالروں پر خراب استری کرنے کے قصور میں ننھا کے دو جھاپڑ کس کس کر لگائے۔

3

"سونگھو" گیندا نے اپنی پھٹی ہوئی کرتی کا گریبان میری ناک سے لگا کر کہا۔

"سوں---- ہا! عطر کہاں سے آیا؟" میں نے بلبلا کر پوچھا۔

"بھیا۔" اور وہ زور سے کھلکھلانے لگی۔ میں بھی رشک کو دبا کر ہنس دی۔

"گیندا!" بھیا نے برآمدے سے پکارا۔ "یہ کوٹ استری کے لئے لے جا" وہ میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھ کر مسکراتی ہوئی چلی۔

"گیندا کیسے چلی تھی؟ جیسے لچکی جا رہی ہو۔ میں جب چلتی تھی تو دھپا دھپ جیسے گھوڑا دوڑ رہا ہو۔ میں تو---- او نہ میرا جی گھبرانے لگا اور میں جل کر باغ میں پانی دینے کی ہودی میں ایک لکڑی اٹھا کر گھنگولنے لگی۔ صبح کی پیسی ہوئی اینٹ کا سیندور اب تک وہیں پڑا تھا۔ بھیا نے گیندا کے تو عطر لگایا اور میرے لگانا شاید بھول گئے۔ بھول کیوں گئے۔ جان کر ہی نہیں لگایا۔ حالانکہ ان کی سگی بہن ہوں اور گیندا وہ تو ان کی کوئی بھی نہیں مجھے بھیا سے نفرت ہو گئی اور میں زور زور سے لکڑی گھمانے لگی۔

"ہاں ہاں۔ کیا کرتی ہو بی بی۔" میوہ رام نے پیچھے سے آکر کہا۔

میں غور سے میوہ کو دیکھنے لگی۔ "میوہ بھی تو میرا کوئی نہیں!" میں نے سوچا۔ مگر میں اس کے ہاتھ دیکھ کر اداس ہو گئی۔ کیا مجال جو یہ کمبخت ذرا اپنے ہاتھ مانجھ

کر میل چھڑائے ہر وقت مٹی کھودتا رہتا ہے۔ مگر خیر۔

"میوہ!" میں نے نرمی سے کہا "ذرا یہاں آ" اور میں غور سے لکڑی میں سے بوندیں ٹپکتی ہوئی دیکھنے لگی۔

"کیا؟" وہ لاپروائی سے مڑا اور ٹوپی آنکھوں پر سرکا کر گدی کھجانے لگا۔

"یہ----- سیندور میرے ماتھے پر لگا دے" میں نے لجاجت آمیز لہجے میں حکم دیا۔

"یہ سیندور ہے" وہ گھٹے گھٹے ہنسنے لگا اور چلا مڑ کر۔

"سن بھئی---- میں تو---- میوہ----- ذرا ٹھہرنا" ایک نئے خیال کے ماتحت میں نے کہا۔

"کیا ہے بی بی؟" وہ ذرا مڑ کر بولا۔

"میوہ---- بیاہ کرے گا؟" میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔

"بیاہ! میرا تو بیاہ ہو بھی گیا" وہ کھرپی کا دستہ پیڑ کے تنے سے ٹھوکنے لگا۔

"کب؟" میں نے مردہ آواز میں کہا۔

"ارے رام! مدتیں گجر گئیں۔" اس نے ایسے کہا گویا کوئی بات ہی نہیں۔

"اچھا تو بدھوا ہے" میں نے فیصلہ کیا۔

"ارے نہیں" وہ ہنسنے لگا۔ "کون کوٹھریا میں مالن بیٹھی ہے۔"

"کیا مالن سے تیرا بیاہ ہوا تھا؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"ہوں۔" اور وہ چل دیا۔

اچھا تو وہ بڑھیا جسے میں میوہ رام کی اماں سمجھتی تھی اس کی بیوی تھی "کیسی عجیب دنیا ہے"۔ میں نے سوچا اور پھر ہودی میں لکڑی ڈال کر زور سے گھمانے لگی------ میں نے جھک کر اپنا گریبان سونگھا کہ شاید وہاں بھی کسی عطر کی خوشبو ہو، مگر دور دور کہیں خوشبو کا نام نہ تھا۔ ہاں صبح جو سالن گر گیا تھا البتہ اس کی بساندھ تھی۔ میں چڑ گئی۔

4

گیندا چپکے چپکے بھیا کے کمرے میں تولیہ میں لپٹے ہوئے کپڑے رکھنے جا رہی تھی- میرے دل میں کھدبدی ہوئی اور دبے پاؤں بلی کی طرح میں بھی پہنچی اور دراز میں سے جھانکنے لگی-

گیندا فرش پر بیٹھی کپڑے گن گن کر الگ کر رہی تھی- بھیا کونے میں کھڑے سر کھجا رہے تھے-

"ہٹ- غلط گن رہی ہے-" بھیا نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر کہا- اس نے ایک نظر بھیا کو دیکھا اور تیوری پر بل ڈال کر ہنس دی- انہوں نے اسے کھینچا تو وہ سکڑ کر دری پہ اوندھے منہ لیٹ گئی اور کسی طرح نہ اٹھی- بھیا نے اس کی کمر میں جو گدگدی کی تو تڑپ اٹھی- بھیا جو آگے آئے تو اس نے ایک تھپڑ ان کے گال پر رسید کیا-

تعجب ہے کہ میں چونک کر نیچے نہ گر گئی- بھیا کے تھپڑ؟ جن کے خوف سے سارا گھر لرزتا ہے، ان کے گیندا نے تھپڑ مار دیا- میں بھاگنے کے لئے تیار ہو گئی- میں نے سوچا اب بھیا نے اس کا گلا گھونٹا اور اب گھونٹا- انہوں نے کچکچا کر اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور اپنی طرف گھسیٹ لیا- میں نے سانس روک لی----- مگر----- ارے لو----- میں حیرت اور خوف سے ملے جلے جذبات سے مجروح ہو کر سرپٹ بھاگی اور کمرخ کے گھنے درخت کے نیچے آ کر دم لیا- میرا کلیجہ بلیوں اچھل رہا تھا- کانوں میں جیسے کوئی انجن چل رہا ہو- بدن لرز رہا تھا- اور زبان خشک تھی میں دیر تک اسی طرح ڈری بیٹھی رہی-

آنکھیں بند کر کے سوچا اور پھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سوچا- مگر خاک جو سمجھ میں آیا ہو- آخر کیوں میری سمجھ میں اتنی ڈھیر سی باتیں نہیں آتیں- خاموش اور گرم دوپہر میں میں نڈھال ہو کر عجیب عجیب معموں سے لڑتی رہی- ایک بھی تو حل نہ ہوا- رونا آنے لگا- جیسے کسی نے مجھے خوب ہی تو مارا ہے-

گیندا برآمدے میں سے لپک کر اتری- میں سمجھ گئی کہ میرے سوالوں کے

جواب وہی دے سکتی ہے۔ گیندا مجھے کتنی باتیں بتاتی تھی۔

"کیا ہوا" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" وہ مکاری سے اترائی۔ مگر فوراً ہی ایک تنہا گوشے میں بیٹھ کر ہم دونوں "عجیب عجیب" باتیں سمجھنے کی کوشش کرنے لگے۔ گیندا نے افوہ، کتنی باتیں بتائیں۔

"ارے، مگر آخر کیوں؟" میں نے سب کچھ سن کر سوچا۔

گیندا کلف چڑھانے چلی گئی اور میں پھر ایسی چلی گئی اور میں پھر ایسی بیٹھی رہ گئی گویا راستہ گم کر دیا ہو۔

میں نے چاہا کہ چھوٹی چھوٹی کمر خیں بین کر ہار ہی بناؤں یا پھر اس نالی کو پورا کرلوں جسے میں نے کل پانی دینے کے لئے کھودا تھا۔ یا پھر ایک نظر با لکمیری کی جھاڑی کے نیچے ہی ڈال آؤں یا نہیں تو لاؤ یہی معلوم کروں کہ "تیتری" نے انڈے کہاں دینے شروع کئے ہیں۔ مگر نہیں میرا تو دل کسی بات میں نہ لگا۔ نہ جانے کیوں ہر کھیل سے میرا جی اکتا گیا تھا اور جی چاہتا تھا چپکی آنکھیں بند کئے ہوئے کوئی خواب دیکھتی رہوں جس میں کوئی ننھی منی دلہن ہو۔ اور بس پھر اسی خیال کی دنیا میں گم ہو جاؤں آخر کیا کروں۔ گیندا کو دیکھو! مگر میں کیا کروں۔ میوہ کے پاؤں کی چاپ سنائی دی اور میں جیسے چونک پڑی ایک خیال، ایک امید کی مٹی ہوئی سی جھلک، اور میں زمین پر دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر اوندھی لیٹ گئی۔

"چچ ---- چچ ہا ---- بی بی زمین پہ؟ اٹھو، اٹھو!" اس نے مجھے دیکھ کر کہا۔

مجھے ایسا معلوم ہوا کوئی مجھے اٹھا رہا ہے اور میں نہیں اٹھتی۔ میری پیٹھ میں کسی نے گدگدی سی کی ---- مگر ---- اونہہ ----

"اٹھو، نہیں تو کہتا ہوں بھیا سے کہ کپڑے میلے کر رہی ہیں۔" اس نے دھمکی دی اور ویسا ہی لٹھ کا لٹھ دور کھڑا رہا۔

وہ نہایت لاپروائی سے بانس کی کھپچی چھیل رہا تھا۔ مگر اس انداز سے نہیں

جیسے بھیا سر کھجا رہے تھے۔

''اٹھتی ہو کہ سچ مچ ہی جا کر کہہ دوں۔'' اور وہ چلا شکایت کرنے۔ ذرا سوچئے میرا کیسا جی جلا۔

''سور، تو کون ہوتا ہے۔ آں۔ ں۔'' میں نے چیخ کر کہا اور ایک پتھر کس کے اس کے گھٹنے پر کھینچ مارا۔

''ارے باپ رے'' ٹھہر تو جاؤ کیسا پٹواتا ہوں۔ دوپہریا پھر گھام میں گھومتی ہیں اور ریتا میں لوٹیں لگاتی ہیں جو کچھ کہو تو ----- ٹھہرو۔ وہ سی سی کرتا چلا۔

''یہ کمبخت میوہ رام سدا کا ٹھس ہے کیا مجال جو مجھ سے سیدھے منہ بات کرجائے۔ بڑا وہی تو ہے نا!۔'' میں ایسی جلی کہ موتیا کی ساری قلمیں جو اس نے گھنٹوں کی محنت کے بعد لگائی تھیں ایک ایک کر کے کھسوٹ ڈالیں۔ ''ایسے انسان کا یہی علاج ہے۔'' میں نے سوچا اور بسورتی ہوئی اندر بھاگ گئی۔

5

کون تھا جو مجھ سے ہمدردی کرتا؟ بھیا نے تو کبھی منہ نہ لگایا۔ اماں نے کبھی یہ لاڈ ہی نہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بلا کی ضدی ہوگئی۔ طبیعت میں جو الجھن پیدا ہوئی تو سب سے ہی بیر باندھ لیا۔

باجی جو اب کے آئیں تو انہوں نے مجھے اپنے ساتھ لے جانے کا ارادہ کیا کیونکہ میں دن بھر واہی تباہی گھومتی تھی اور لڑتی پھرتی تھی۔ مجھے گیندا کے چھوٹنے کا بڑا افسوس تھا۔ مگر سفر کی خوشی کچھ ایسی ہوئی کہ سب کچھ بھول گئی۔

گیندا۔ بھیا۔ میوہ اور ساری پرانی باتیں دو سال کے عرصہ میں خواب ہوگئیں اور جب میں واپس آئی تو دنیا ہی بدل گئی تھی۔ بھیا دہلی بھیج دیئے گئے تھے۔ ان کے کمرے میں مہمان ٹھہرتے تھے۔ میوہ رام نمونیہ سے مرگیا تھا۔ کیونکہ اس نے پانی مٹی سے کھیلنے کی عادت نہ چھوڑی اور سردی لگ گئی۔ تعجب ہے کہ میں خوشی اور حیرت سے بے ہوش نہ ہوگئی۔ جب میں نے سنا کہ گیندا کے بچہ ہوا تھا۔

اظہار مسرت پر مجھے ڈانٹا گیا۔ میں خاک نہ سمجھی کہ کیوں؟ ہاں اتنا تو سنا۔
"اے ہے بتہری تو اس نے کوشش کی---- مگر وہ تو----" آگے میں نے نہیں سنا کہ شیخانی نے کیا کہا۔
"اے ہے وہ تو مارے ڈالتا تھا۔ بڑی آفتیں اٹھیں" بیوی نے کہا "میں نے فوراً" اسے دہلی چلتا کیا۔ پڑھنے والا بچہ! یہ نیچ ذات کمینیاں شریفوں کو یونہی ----" اور پھر باوجود سانس روک کے سننے کے میں آگے نہ سمجھ سکی۔
"گیندا کا بچہ!" میں بستر پر لیٹی رہی بار بار دہرانے لگی مجھے حیرت پہ حیرت تھی مگر یہ بچہ!---- آخر کیوں؟"
"وہ تو اگر سرکار کو خبر ہو جاتی تو جانے کیا ہوتا۔ اسی لئے تو میں نے اسے جلدی سے دفعان کیا" مجھے بیوی کی آواز پھر سنائی دی۔
اب میں سمجھی، اوہو! میری نظروں کے سامنے ساری گزشتہ باتیں سینما کی تصویر کی طرح پھر گئیں اور میرا دل بیٹھنے لگا۔ لیکن فوراً" ہی گیندا کے بچے کو دیکھنے کے لئے میں بے قرار ہو گئی۔ میری آنکھوں میں ننھا منا سا بچہ پھرنے لگا، جیسا ہم نے ریل میں لاہور جاتے وقت دیکھا تھا۔ ذرا سا بچہ مگر کتنا پیارا۔ ہمارے یہاں تو کوئی بھی بچہ نہیں۔ کوئی بچہ مہمان بھی نہیں آتا۔ مجھے گیندا کے بچے پر پیار آنے لگا۔ اندھیرے میں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی کے ننھے ننھے ہاتھ میری ٹھوڑی اور گردن پر رینگ رہے ہیں۔ میں چپکی لیٹی رہی کہ کہیں وہ چھوٹی چھوٹی فرشتوں جیسی انگلیاں میرے ہلنے جلنے سے بھاگ نہ جائیں۔
رات کو خواب میں بچے ہی بچے، سینکڑوں بچے عجیب عجیب شکلوں کے گیندا کی شکل کے، میری شکل کے، بھیا کی شکل کے، یہاں تک کہ مرے ہوئے میوہ رام کی شکل کے سینکڑوں بچے، کلبل کرتے۔ کچھ بے بالوں کے، کچھ بالوں دار، گول مٹول سر، ذرا ذرا سے ہاتھ۔ ریت کے بے شمار ذروں کی طرح ساری کائنات پر بکھرے ہوئے تھے۔
صبح میں چھپ کر گیندا کے بچے کو دیکھنے چلی ہی گئی۔

6

گیندا اپنی کوٹھری میں دروازے کی طرف پشت کئے جھکی ہوئی کچھ کر رہی تھی، میرے پیروں کی چاپ سن کر وہ چونک پڑی اور ڈر کر مجھے دیکھنے لگی اور جلدی سے اس نے اپنے کپڑے سمیٹ لئے۔ میں نے سامنے جاکر دیکھا تو ایک مختصر ترین نیم برہنہ انسان اس کے گھٹنے پر پڑا ہوا اپنا کلھیا سا منہ پھاڑ رہا تھا۔

"اوئی کتنا منا سا ہے" میں نے اس کے پاس اکڑوں بیٹھے ہوئے کہا۔

گیندا کتنی دبلی ہو گئی تھی جیسے لکڑی۔ وہ کچھ گھبرائی ہوئی تھی۔ اس نے میری طرف سے منہ پھیر لیا۔

ہائے۔ جان ہے تیرا بچہ تو۔" میں نے خوشی سے چیخ کر کہا۔ "اور زمین پر بیٹھ گئی۔ جی چاہا گیندا اور اس کے بچے کو اٹھا کر کلیجہ سے لگا لوں۔ مجھے نہ جانے کیوں رونا آنے لگا۔

"ذرا مجھے دے گیندا" میں نے ہاتھ بڑھا کر کہا۔ مگر وہ خاموش بیٹھی اپنے آنسو پونچھتی رہی۔

"ارے رو رہی ہے تو" مجھے تو رقت آنے لگی۔ "ایک تو اتنا گذو بچہ ہے اور پھر رو رہی ہے۔ لا مجھے دے۔"

وہ سر جھکائے منہ پونچھتی رہی اور بچے کو چھوا تک نہیں۔ میں نے چاہا بچے کو گود میں لے لوں۔ ای۔ ای۔ وہ تو ایسا گلگلا جیسے گوشت کی بوٹی اور کسی طرح نہ اٹھا۔

"اونہہ گیندی، ذرا اٹھا دے۔" میں نے اپنے پرانے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

گیندا نے مجھے غور سے دیکھا۔ جیسے وہ میری آنکھوں میں کچھ تلاش کر رہی ہو۔ شاید جو کچھ وہ ڈھونڈھ رہی تھی اسے مل گیا اور اس نے ایسی آسانی سے بچے کو اٹھا کر مجھے دے دیا کہ میں اس کی مشاقی پر حیران رہ گئی۔ جیسے روئی کا گالا۔ ہلکا پھلکا دبلا سا بچہ۔

میں اسے ٹاٹ پر لئے بیٹھی رہی اور گیندا نے مجھے لاکھوں کروڑوں عجیب عجیب باتیں بتائیں- کس طرح وہ مہینوں ماری گئی- چودہ پندرہ برس کی گیندا خود بھی بہت سی باتیں نہیں سمجھتی تھی- مجھے کیسے بتاتی- ہم دونوں "کیوں" "کیسے" اور "ارے" پر آکر رک جاتے-

جب بہو کے کالا کلوٹا بچہ ہوا تھا جو کچھ دن بعد ہی مرگیا تو کیسے گانے بجانے ہوئے تھے- بہو کو منوں گھی اور گڑ ٹھنسایا گیا- اور اب جو گیندا کا اتنا گورا سا بچہ ہوا تو کچھ بھی نہیں- گیندا پٹی اور بھوکی رکھی گئی اور مرتے مرتے بچی- تب یہ ننھا سا "للو" آیا- للو کے پاس دو ہی کرتے تھے ٹھنڈ میں مرا جاتا تھا- رات بھر روتا تھا- بہو اسے ہر وقت کوستی تھی کہ مرجائے تو چھٹی ہو جائے- گیندا نے چپکے سے للو کے پیر میں کالا ڈورا بھی باندھ دیا تھا کہ کہیں اسے نظر نہ لگے اس نے صاف صاف اعتراف کرلیا کہ للو دنیا بھر میں سب سے زیادہ پیارا ہے اور ہاں میں بھی اور بھیا بھی- بھیا کے نام پر اس کی آنکھیں اپنی پرانی روشنی سے چمکنے لگیں اور ان کا متواتر ذکر کرتی رہی-

"وہ اب چھٹیوں میں بھی نہیں آتے؟"

"ہاں اب آئیں گے- پارسال مسوری چلے گئے تھے" میں نے بچے کی انگلیاں گنتے ہوئے کہا-

"تم انہیں چٹھی لکھو گی، کیوں بی بی؟" اس نے شوق سے پوچھا-

"ہاں، ہاں" میں نے زور سے سرہلایا-

"ہاں تو لکھ دینا کہ للو تمہیں بہت بہت سلام کہتا ہے اور بہت ہی یاد کرتا ہے"

"اچھا-" میں نے کہا- حالانکہ للو چوں بھی کرنا نہ جانتا تھا-

"اور یہ بھی لکھنا کہ اس کے لئے اب کے لال بنیان لائیں- جیسی بسنتی کا چھورا پہنے ہے"

"اور---- یہ کہ-----" اس نے شوق بھری نظروں سے خلا میں دیکھتے

ہوئے کہا۔

"اب کی بار چھٹیوں میں دو چار دن کے لئے ضرور آنا" جیسے وہ کسی سے التجا کر رہی ہو۔ اور وہ ہلکے سے ہنس دی۔ وہ نہ جانے کیا بکتی رہی اور میں للو کے بالوں سے کھیلتی رہی۔

"دیکھ----- دیکھ گیندا کیسے چچوڑ رہا ہے----- آ آ" میں نے انگلی میں گدگدی محسوس کر کے کہا۔

"بھوکا ہے۔"

گیندا شرما گئی۔

"لے بھئی۔ نہیں رو دے گا پھر۔"

گیندا نے اپنے دبلے پتلے ہاتھوں سے بچے کو اٹھا لیا اور تھوڑی ہی دیر میں اسے کلیجہ سے چمٹا لیا اور ساڑھی میں منہ چھپا کر ہنستی رہی۔

میں بڑے شوق سے ننھے للو کے پتلے پتلے ہونٹوں کو دیکھتی رہی اور وہ لمبی لمبی سانسوں سے دودھ پیتا رہا۔ ننھی سی ماں پھوٹ پڑنے سے اسے سنبھال رہی تھی۔

شادی

جیسے ہی لال پیلی جھنڈیوں کی قطاریں اور رنگین کھمبے نظر آنے لگے میں نے تانگے کو رکوا کر اترنے کی کوشش کی۔

"ابھی تو بہت دور ہے سرکار!" تانگے والا گھوڑے کو چابک سے سہلا کر بولا۔

"رہنے دو، بس۔ لو کتنے دام ہوئے تمہارے" میں نے چونی دیتے ہوئے کہا۔

"گیٹ تک چلوں!" وہ چونی داب کر بولا۔

"نہیں۔"

میں اتر پڑی۔ گدھے کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ راجہ کالی چرن کے یہاں تانگے میں آنا کس قدر گھٹیا ہے ذرا غور تو کیجئے تو پتہ چلے کہ اگر مانگے کی سب موٹریں عین موقع پر غائب ہو جائیں اور کرائے کی ٹیکسی ڈھونڈھے نہ ملے تو کیسی مصیبت ہو جاتی ہے۔

بھرے ہال کے سامنے ٹانگیں تھرتھرانے لگیں۔ خیر سے مسٹر دوبے اپنے مخصوص قہقہے کو دبائے ہوئے استقبال کو مل گئے۔

"آپ آگئیں؟" میں کار لے کر جانے ہی والا تھا۔

میں اپنی جلدی پر پچھتائی۔ تانگے کے جھٹکوں کو کوستی آگے بڑھی۔ ہال جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ فرش پر پیر پھسلے جاتے تھے آنکھوں کے سامنے ننھے ننھے تارے تھرکنے لگے۔ دور کہیں چھپا چھپایا ارغنوں دھیمے اور میٹھے سروں میں بج رہا تھا۔ میری ناتجربہ کار آنکھوں کے لئے یہ الف لیلہ کے کسی پرستانی سین سے کم نہ تھا۔ مسٹر دوبے نہ جانے کیا بڑبڑائے جا رہے تھے۔ میں تو نئی نئی تراش کے جمپروں کو تکتی، ساریوں کے رم جھماتے جھوم دیکھتی یہی چلی جا رہی تھی اور دوبے کے کھنکے دار بے تُوچ قہقہے ذرا جگا دیتے تھے۔

کسی نے مجھے پیچھے سے کھینچا اور میں سیلیا کو دیکھتے ہی گھوم پڑی- اس کے پاس ہی بیٹھے ہوئے نہ جانے کون صاحب جلدی سے اچک کر کرسی خالی کر گئے اور میں بغیر شکریہ ادا کئے بیٹھ گئی- دوبے کے قدم آگے نکل گئے جب انہیں پتہ چلا کہ میں راہ میں ہی* ٹپک گئی- ذرا کے ذرا ان کا ہاتھ سر کھجانے کے لئے اٹھا- مگر پھر وہ مہمانوں کے ریلے کو سنبھالنے کے لئے بڑھ گئے-

سیلیا نے بعد میں قاعدہ بتانے* کا وعدہ کر کے مجھے بٹے ہوئے پتوں کی گڈی پکڑا کر کھیل شروع کر دیا- نہ جانے ہم کا کھیل بڑی تن دہی سے کھیلنے لگے- بس قہقہے زیادہ لگانے پڑتے تھے اور ہاتھ کم بنتے تھے- وہی صاحب جو کرسی دے کر پاس والے کی کرسی کے بازو پر بیٹھ گئے تھے- ازراہ کرم مجھے بتانے لگے-

"ہیں، ہیں! یہ کیا چل رہی ہیں- 7 کٹ نہیں جائے گا؟ وہ میرے ہاتھ سے پتا لے کر بولے-

میں قطعی نہیں سمجھی کہ کیا کٹ جائے گا اور ان کی اس گستاخی پر غور کرنے لگی- جو انہوں نے پتہ چھین کر کی تھی-

"آپ یہ چلئے" وہ میرے پیچھے کھڑے ہو کر بتانے لگے-

"بھئی بتانے کی نہیں ہے نور!"

"لیکن بتانے کے خلاف جہاد کرنے والے میرے لئے زبردست معمہ حل کر گئے- یعنی یہ کرسی دینے والے نور تھے- کون نور؟ یہ مجھے اسی وقت معلوم ہوا ٹینس کے بہترین کھلاڑی آئی- سی- ایس کے کامیاب رکن، سوسائٹی کی جان- دوستوں کے ٹھیکیدار اور نہ جانے کیا الم غلم-

اور وہ برابر میرے* پتے چلنے لگے- مگر اس سے پہلے کہ وہ اگلا پتہ پکڑتے میں نے خود ہی جلدی سے ڈال دیا اور وہ صرف میری انگلی نوچ کر رہ گئے- سب زور سے ہنسے اور انہوں نے بھی معافی مانگی- بڑی معصومیت سے-

اس کے بعد ہم لوگ اس سے بھی اوندھا اور دیوانہ سا کھیل چند گولیوں اور ایک چوکھٹے کی مدد سے کھیلنے لگے- مسٹر دوبے مہمانوں کو شاید ہانک چکے تھے- چونکہ

وہ بھی اپنے مخصوص قہقہوں سے کھیل کو اور بھی پگھلائے دے رہے تھے۔

اس پر میں نے بعد میں غور کیا کہ سارے ہال میں سوائے نور کے سب ہی سیاہ ڈنر سوٹ میں جکڑے ہوئے تھے مجھے یہ معلوم کر کے ذرا بھی تعجب نہ ہوا کہ نور سیدھے ٹینس کورٹ سے پکڑ کر لائے گئے ہیں اور سفید پتلون اور سبز قمیض کی معافی کے لئے ان کا ریکٹ اور مفلر وغیرہ سامنے ہی میز پر رکھا ہوا بار بار مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر رہا تھا کہ آج ڈنر پر سب کے لئے سبز قمیض اور سفید پتلون پہننا لازمی کیوں نہ رکھا گیا۔ میں نے پختہ ارادہ کرلیا کہ اگر اب کے شاید نینی تال جانا ہوا یا مسوری گئی تو سفید پتلون اور سبز قمیض شام کو پہننے میں کیا ہرج ہو گا۔

ڈنر اس قدر دلچسپ رہا کہ جلد ہی مجھے وہ پریشانی جو چاندی کے بوجھل چمچوں کو قابو میں لانے میں اٹھانا پڑ رہی تھی' غائب ہو گئی۔

مسٹر دوبے جو بالکل ہی قریب بیٹھے تھے بار بار گزرے ہوئے کھیل کے بھدے پن کا ذکر کر کے قہقہے چھوڑ رہے تھے۔ نور کا بھی ذکر آیا وہ ایک بھورے بالوں والی ہلکی پھلکی چھوکری سے کچھ اس انہماک سے باتیں کر رہے تھے کہ چاندی کے چمچے مجھے پھر بے ڈول' بڑے اور بوجھل معلوم ہونے لگے۔ مسٹر ڈوبے نے کئی کئی بار لوگوں کو چمچے اور چھری کے جھٹکے سے متعارف کرایا۔

"یہ مسٹر سنگل ہیں' ایم- ای- ڈی اور وہ؟" آلو کی نوک سے اشارہ کر کے کہنے لگے مسٹر----- آں- وہ مختار۔" مسٹر مختار بت کی طرح خاموش- ذرا پختہ سن کے دراز قد انسان تھے۔ جب ہم لوگ تاش کھیل رہے تھے اس وقت بھی وہ دور میز سے ٹیک لگائے نہ جانے کیا سوچ سوچ کر دھواں اڑا رہے تھے ان کا لکڑی کے کاروبار کا کچھ جھگڑا تھا۔ کئی دفعہ میں نے انہیں اپنے گروہ کی طرف بلکہ خود اپنی طرف دیکھتے دیکھا۔ پتہ نہیں کیوں' وہ ویسے ہی غیر دلچسپ رہے۔

"بڑا شریف آدمی ہے بچارا۔ تین چار جگہ بیوپار چلتا ہے اس کا" مگر میں مرعوب نہ ہوئی اور ڈنر کے بعد عجیب کھیل شروع ہوئے۔ ہم دو دو ہو کر کھڑے ہوگئے۔ یہاں تک کہ راجہ صاحب جب میرے ساتھی بنائے گئے تو وہ بھی مسکراتے

ہوئے دائرے میں آگئے۔ ہم لوگ کرسیوں پر بیٹھ گئے اور ہمارے ساتھ پیچھے کھڑے ہوگئے۔ مسٹر ڈوبے اپنی خالی کرسی کی پشت پکڑے اپنے مخصوص قہقہے لگا رہے تھے۔

"اچھا سنئے" سیلیا نے تالی بجا کر تھیٹر کے مینجر کی طرح سب کو متوجہ کر کے کہا۔

تھوڑی دیر کے لئے کھیل بالکل اودھم میں تبدیل ہوگیا۔ نور اپنی کرسی والی بھورے بالوں والی دبلی حسینہ سے کچھ جھک کر کہہ رہے تھے اور اس نے ہنس کر آہستہ سے تھپڑ اٹھایا۔ نور سیدھے کھڑے ہوگئے۔ اس عرصے میں میں نے کھیل کے قواعد بھی نہ سنے، مگر دیکھا کہ خالی کرسی والا آنکھ کے اشارے سے دوسری کرسیوں پر بیٹھی ہوئی مورتیوں کو بلاتا ہے اگر اس کے پیچھے والا ذرا ہوشیار نہ ہو اور عین وقت میں اسے پکڑ نہ لے تو وہ خالی کرسی پر نظر آتی ہے۔ اور خوب غل پڑتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد نور کی بھورے بالوں والی لڑکی دوبے کے سامنے کرسی پر اڑی بیٹھی ان کے سریلے قہقہے سن رہی تھی۔ میں نے ایک گہری سانس لی۔

"بھئی سب کو خالی کرسی والے کی طرف متوجہ رہنا چاہئے" نور نے کہا اور اپنی سیاہ پلکوں کو جھپکایا۔ نور نے آہستہ سے بائیں آنکھ کے کونے کو دبایا اور اس سے قبل کہ سیلیا اٹھے اس کے زبردست ساتھی نے اسے جکڑ لیا۔ سب پھر خاموش بیٹھ گئے۔ نور نے پھر اشارہ کیا لیکن شاید مجھے۔ میں نے نیچے پڑے ہوئے قالین کے نقش و نگار کو گھورنا شروع کیا۔

نور بولے۔ مسٹر ڈوبے یہ کھیل کے قانون کے خلاف ہے کہ خالی کرسی پر کوئی۔۔۔۔۔" راجہ صاحب تو جیسے سو رہے تھے وہ شاید بالکل ہی کھیل کو سمجھنے کی کوشش نہ کر رہے تھے اور جب میں اٹھ کر نور کی کرسی پر بیٹھی تو ویسے ہی قریب والی کرسی پر بیٹھی ہوئی لیڈی ڈاکٹر سے اپنی بہو کی بیماری پر پرزور مباحثہ کر رہے تھے۔ میں کھیل کے خلاف لیکن شریک ہی رہی۔

تھوڑی دیر میں کھیل میں جان پڑ گئی۔ مسٹر مختار کی کرسی خالی ہوئی اور

تالیوں، قہقہوں نے کان پھاڑ دیئے۔ ان کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

"مختار صاحب۔ بُری خالی ہوئی۔۔۔۔۔ یہ تو۔۔۔۔ قی۔ ہی۔ ہی" دوبے ہنسے۔

سب جیسے مختار صاحب کو چھیڑنے پر تلے ہوئے کوئی اپنا ساتھی دینے کو تیار نہ تھا۔

"نا صاحب" ایک موٹے سے انجینئر صاحب اپنی کرسی کو خالی ہونے سے روکتے ہوئے بولے۔ "مختار اس کی دوستی نہیں"۔

اور جیسے ہی میں اٹھنے لگی، نور نے جھپٹ کر پکڑ لیا۔

"اوہو آپ سمجھیں میں سو رہا ہوں۔۔۔ خوب" میں خاموش بیٹھ گئی۔ بھورے بال والی سے باتیں کرنے کی کچھ تلافی ہو گئی۔

"معاف کیجئے گا گستاخی۔ مگر آپ ابھی نہیں جاسکتیں۔۔۔۔ جب میری باری تھی تب تو گویا آپ دیکھ ہی نہیں رہی تھیں۔۔۔۔" نور پھر مجھے روک کر بولے۔

میں اور نور تھوڑی ہی دیر میں باتیں کرنے لگے۔ اس نے بتایا کہ نیلی یعنی اسی بھورے بالوں والی لڑکی نے بتایا کہ میں بھی ٹینس کھیلتی ہوں۔ میں نے ان کی ٹینس کی دعوت بالکل بے خبری میں قبول کرلی۔ چونکہ میں بڑے غور سے یہ سوچ رہی تھی کہ وہ شاید نیلی سے میرے ہی متعلق پوچھتے رہے ہوں گے۔

نیلی سے ملنے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ کس قدر روشن دماغ ہے اس نے مجھے دوبے کے یہاں ٹینس کھیلتے دیکھا تھا۔

رات بھر میں دعوتوں، سبز قمیضوں اور ٹینس کے الجھے سلجھے خواب دیکھا کی۔

شام کو نور خود کار لے کر آگئے۔ میں ڈیڑھ گھنٹے سے تیار بیٹھی تھی۔ میں شاید زندگی میں بہترین کھیل کھیلی کم از کم نور کا تو یہی خیال تھا۔

نور نے باقاعدہ ایک ٹینس کلب قائم کردیا۔ سیلیا اور دو چار بے فکرے ممبر

بنے بڑی تگڑی فیس رکھی گئی۔ مگر ادا کرنے کی نوبت ہی نہ آئی۔ چند ہی روز میں سارے ممبروں کو روگ لگنے شروع ہوگئے۔ سیلیا کو سخت زکام ہوگیا۔ ایک دوسرے صاحب کو ضروری کاموں کی بھرمار رہنے لگی۔ مگر ہم دونوں جی چھوڑ کر کھیلتے----- روز روز کھیلتے اور مہینوں کھیلتے رہے۔

نور کس قدر دلچسپ انسان ثابت ہوئے ہم گھنٹوں بکواس کرتے اور ذرا جی نہ اکتاتا۔ انہوں نے کئی خوبصورت اور کار آمد کتابیں دیں۔ ان کے تحفوں سے جی گھبرا گیا۔ میری کئی تصویریں ان کے پاس بڑی کی ہوئی رکھی تھیں۔ لیکن بچوں کی طرح چھپائی ہوئی اور جب میں نے دیکھ لیں تو باتیں بنانے لگے۔

مسٹر دوبے کس قدر شوقین طبیعت تھے انہیں اپنی شادی کا دن منانے کا جنون تھا اور اوپر سے ہوا بیٹا۔ زبردست دعوت دے ڈالی اور سیلیا کو پہلے ہی سے لینے کے لئے بھیج دیا۔ میں نے شام کو نور کے ساتھ ٹینس کا پختہ وعدہ کیا تھا۔ آج وہ آٹھ دن بعد دورے سے جب چڑے ہوئے لوٹے اور یہ معلوم ہوا کہ میں دوبے کے یہاں ہوں تو تنتناتے آئے "آپ اپنے وعدے تو خوب یاد رکھتی ہیں۔" وہ کڑوا منہ بنا کر بولے۔

"ارے سیلیا ادھر----- یہ ہیں تمہاری سہیلی۔" دوبے میرا کندھا ہلا کر چلائے۔ اور بات کاٹ دی اور سیلیا مجھے وہی بے وقوفوں والا چوکھٹے کا کھیل کھلانے لے گئی مجھے موقع بھی نہ ملا کہ نور صاحب کا مزاج تو پوچھوں۔

"تم نیلی سے تو ملی ہو؟" میں نے چوکھٹے میں گولی گھما کر کہا۔

"کون، نیلی پنیر؟ ہاں۔ شش بے وقوف ہے وہ" سیلیا گولی تاکتی ہوئی بولی۔

"کیوں، کیا کی اس نے بے وقوفی؟" میں نے پوچھا۔

"ارے! جیسے تمہیں کچھ معلوم نہیں----- یہ نور صاحب-----" وہ ہکلا گئی۔ کیونکہ نور جیبوں میں ہاتھ ڈالے سر پر سوار تھے اور تیکھی چتون سے گھور رہے تھے۔ ہم چپ ہو کر کھیلنے لگے۔

"اگر آپ گھر جانا چاہیں تو کار حاضر ہے" نور نے روٹھے انداز سے کہا۔

"ضرور بشرطیکہ آپ پہنچا آئیں" میں نے ہنسی روک کر کہا۔ ان کی کچھ روٹھی ہوئی شکل اور بھی دلچسپ ہوجاتی تھی۔ ہم خاموش روانہ ہوگئے نور اسی طرح منہ پھلائے بیٹھے رہے۔

"بہت غصہ ہے آج آپ کو" میں نے ان کو بغیر دیکھے کہا یوں ہی چھیڑنے کو۔

"کیا کہہ رہی تھی ۔لیا؟" وہ سختی سے بولے۔

"کچھ نہیں، آپ آگئے اور وہ---" نور نے ایک لمبی سانس لی۔

انہوں نے مجھے خود ہی بتایا کہ انہیں اس ذکر سے کیسی نفرت تھی۔ نیلی سے انہوں نے کبھی کوئی غرض نہ رکھنی چاہی۔ مگر وہ نہ جانے کیوں پیچھے لگی ہوئی تھی اور یہ------ یہ اس قسم کی باتیں ہی ان کی شان میں بڑی کوفت دیتی ہیں۔

"مگر اس میں بچوں کی طرح چڑنے کی کیا بات ہے۔ آپ لڑکی تو ہیں نہیں جس کے لئے کسی دوسرے کا پسند کرنا بھی موٹی سی گالی ہو۔"

"ہوں" انہوں نے طنزیہ ہونٹ سکیڑ کر کہا۔ "اچھا چھوڑو گی بھی اس قصے کو؟" وہ ایک دم اکتا کر بولے۔

"کل شام کو کہاں تشریف لے جانے کا ارادہ ہے؟ اگر تکلیف نہ ہو تو--- خیر وہ میچ تو پورا کرنا ہی ہے۔"

"وہی جس میں آپ ہار رہے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"ہونہہ! ہار رہا تھا!"

"اور کیا؟ گویا آپ بھول گئے۔ آپ اتوار کو ہار ہی تو رہے تھے!"

"کونسی اتوار؟" وہ شرارت سے مسکرائے۔

"وہی جس دن مسٹر مختار کے یہاں گئے تھے۔"

"ہوگی بابا، چھوڑو بھی" مسٹر مختار کے ذکر سے نور کے تن بدن میں آگ لگ جاتی تھی۔ انہوں نے کسی دور دراز کے رشتہ دار سے کچھ شادی کے سلسلہ میں مجھے بھی شریک کیا تھا۔

"اچھا آدمی ہے بچارا"
"بہت" طعن سے بولے۔
"کافی شان دار پارٹی تھی۔" میں نے پھر کہا۔
"بہت" وہ دانت بھینچ کر ہنسے۔
"بہت اچھا ٹیسٹ ہے مکان کے بارے میں۔"
"بہوت !!!" نور نے جیسے مجھے کاٹنے کے لئے منہ پھاڑ کر کہا۔
تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد نور نے سرمایہ داروں کو الٹی سیدھی سنانی شروع کیں۔ اگر ان کے پاس روپیہ ہوتا تو وہ کبھی گورنمنٹ کی غلامی نہ کرتے اور گھر بیٹھ کر قوم کی کچھ خدمت کرتے میں نے کچھ تجارت کے لئے کہا تو تمسخر اڑانے کے لئے بہت ہنسی کو روکا اور جھک کر شیشے میں سے دور سیاہی کو گھورنے لگے۔
میں نے نور کو لبھانے کے لئے کبھی بھڑکیلے کپڑوں وغیرہ کو اہمیت نہ دی تھی۔ مجھے جب سے معلوم ہوا تھا کہ وہ سفید اور سادہ کپڑوں پر جان چھڑکتے ہیں۔ میں نے ریشمی کپڑوں کو پہننا بالکل ہی چھوڑ دیا تھا۔ میرے ہاتھ میں صرف سیاہ چوڑیوں کا ایک لچھا تھا۔ باتوں کے درمیان کبھی کبھی میں ایک چوڑی دانستہ توڑ کر اس کے ٹکڑے کر کے پھینکتی جاتی۔
"اونہوں، کیوں توڑتی ہو؟---" انہوں نے تازہ چوڑی ٹوٹنے پر مجھ سے ٹکڑے چھین کر کہا۔
میں نے باتوں باتوں کے جوش میں پھر چوڑی توڑی۔ "پھر! میں کہتا ہوں اب کے چوڑی توڑی تو سب ایک دم توڑ ڈالوں گا" یہ کہہ کر انہوں نے زور سے میرا ہاتھ دبایا۔ چٹ چٹ بہت سی چوڑیاں ٹوٹ گئیں۔
"ارے------ بھئی مجھے کیا معلوم تھا۔ میں نے تو یونہی ذرا پکڑا تھا۔" انہوں نے ہاتھ پکڑ کر کہا اور پھر چھوڑ دیا۔
"ذرا ایک کام تو کرو" انہوں نے تھوڑی دیر بعد کہا۔ "ذرا--- بھئی سگریٹ تو نکال کر جلا دو۔ ادھر ہے ادھر------" وہ ٹھوڑی سے داہنی جیب بتا کر

کہنے لگے۔

• جھک کر سگریٹ کیس تک پہنچنے میں بالکل آڑا ہونا پڑا۔ میرا چہرہ جھک کر ان کے اتنا پاس آگیا کہ گرم گرم سانس بالکل کان کے پاس محسوس ہوئی ----- وہ اور جھکے مگر رک گئے۔

"نکال بھی چکو" وہ جھنجلا کر بولے۔ وہ بے طرح اپنا ہونٹ چبانے لگے ٹینس کھیلنے میں گیند مس کر کے ان کی یہی حالت ہوتی تھی۔"

میں نے سگریٹ دی۔ جسے انہوں نے آہستہ سے لبوں میں پکڑ لیا۔ ان کی قرب کپڑوں کی مخصوص خوشبو، سگریٹ کی بھینی بھینی مہک خاموشی میں مل جل کر مجھے نیند سی آنے لگی۔ موٹر آہستہ آہستہ تھرکتی سر سراتی تیر رہی تھی--- رفتار اتنی بتدریج کم ہوگئی کہ مجھے کار کے رکنے کا پتہ بھی نہ چلا۔ انہوں نے جھک کر میری طرف کی کھڑکی کھولی تو ان کا سر بالکل میری ناک کے پاس آگیا اور ایک دفعہ تو میں ان کے بازوؤں کے حلقے میں آگئی ان کا ہاتھ ایک لحہ کو رک گیا----- مگر ساتھ ساتھ کھڑکی کھل گئی اور میں باہر تھی---- وہ پھر ہونٹ چبا رہے تھے۔

جب بستر پر لیٹی تو جسم ٹوٹ رہا تھا۔ ایک عجیب مسرت بھری تھکن دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی------ راجہ صاحب کے پوتے کی سال گرہ سے لے کر آج تک کے واقعات سینما کی تصویروں کی طرح بار بار ناچ رہے تھے۔ اس دن انہوں نے ادب سے کرسی خالی کر کے مجھے جگہ دی تھی----- اور بھی تھے ہزاروں، اس دن مختار کہاں تھے؟----- بے وقوفوں کی طرح دھواں اڑا رہے تھے اور فرنیچر کا تخمینہ لگا رہے تھے۔ مجھے نیلی کا خیال آیا۔ غریب لڑکی مجھے اس پر بہت رحم آیا۔ بے رخی تو دیکھو، ملے تک نہیں۔ اس سے نیلی کو مجھ سے تو جلنے کا کوئی حق نہیں۔ میں نے تو نہیں کہا کہ تم اس سے نہ ملو۔ ان کی عادت ہی عجیب ہے۔ کتنے مہینے ہوگئے ہیں میں نے انہیں کسی لڑکی سے ملتے جلتے نہیں دیکھا۔

مجھے پھریری آگئی- جب میں نے سوچا کہ کیسا لگتا ہو گا' جب جسے چاہو وہ کسی دوسرے سے محبت کرنے لگے- میں نے ارادہ کرلیا کہ نیلی سے انہیں ملنے پر مجبور کیا کروں گی- اس کے کچھ تو زخم بھر جائیں گے اور سچ کہتی ہوں اس میں غرور کا شائبہ بھی نہ تھا-

مجھے یقین تھا کہ وہ اس دفعہ دہلی سے ضرور انگوٹھی لے آئے ہوں گے- یقیناً" اس میں سبز رنگ ہو گا جس کے چاروں طرف ہیرے جھلملا رہے ہوں گے- اندھیرے میں مجھے اپنے بائیں ہاتھ کی چھنگلی کے پاس انگلی تو نظر نہ آئی لیکن ہیروں کا حلقہ جس کے بیچ میں سبز رنگ دمک رہا تھا آنکھوں کے سامنے چکر کھانے لگا- کچھ عجیب نیم خوابی کی سی کیفیت تھی- دھندلی دھندلی تصویر آنکھوں کے سامنے پھیرے لگا رہی تھی- ان کا سراب بھی مجھے بالکل قریب' تکیہ کے پاس جھکا ہوا محسوس ہو رہا تھا اور ایک دم سے جیسے میں ایک خوب صورت آراستہ گھر میں انتظام خانہ داری میں منہمک نوکروں کو احکامات دیتی نظر آنے لگی- اسی چہل پہل اور پرنور* فضا میں ایک ننھا سا بچہ جس کے بال بالکل نور کی طرح گھومے ہوئے اور گھنے تھے اور ویسے ہی بھرے ہوئے خوش رنگ ہونٹ مجھے اپنے بہت قریب محسوس ہوئے اور میں سوچنے لگی کہ یہ کھلونا بڑا ہو کر سبز قمیض اور سفید پتلون پہن کر کتنی اچھی ٹینس کھیلے گا-

شام کو ذرا دیر تک انتظار کرنے کے بعد نور نہ آئے- میں نے چاہا کچھ دیر اخبار ہی دیکھ لوں' یا سویٹر ہی بنوں' مگر روہانسی ہو گئی اور جی نہ لگا- کہ اتنے میں نور کی موٹر کا ہارن آہستہ سے بجا- سن سے جیسے کسی نے سر سے پیر تک بجلی لگا دی---- وہی سبز قمیض اور سفید پتلون پہنے گلے میں مفلر جھولتا بڑی شان سے ریکٹ ہلاتے جناب داخل ہوئے اور آتے ہی بے ڈھنگوں کی طرح کرسی پر لیٹ گئے-

"اجازت ہے؟" وہ لیٹتے لیٹتے جوتا کھولنے کا ارادہ کر کے کہنے لگے-

"نہیں" میں نے رعب سے کہا-

"ارے بھئی یہ کیوں؟" وہ تعجب سے بھویں چڑھا کر بولے۔

"یوں کہ ---" میں نے نیچے بیٹھ کر ان کے جوتے کھول دیئے۔

وہ آہستہ سے اٹھ کر بیٹھ گئے۔ جیسے کسی نے ان کے کہیں چوٹ مار دی۔ غور سے کچھ دیر مجھے دیکھتے رہے۔ پھر میری مسکراہٹ اور کھسیانہ پن پر خود بھی ہنس پڑے۔ ان کی آنکھوں سے سچی الفت ٹپک رہی تھی۔ وہ انگڑائی لے کر پوری کرسی پر پھیل گئے۔

"ارے ----- میرا سوٹ کیس ----" انہوں نے چونک کر کہا۔

"کیسا سوٹ کیس؟" میں نے پوچھا۔ لیکن فوراً ہی مجھے دروازے کے پاس نظر آگیا۔ میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ کیا ہوگا اس میں؟ میرے تخیل کی پھرتیلی آنکھوں نے اس میں رکھی ہوئی زرین ساریوں کی تہوں میں آنکھ مچولی کھیلنا شروع کی --- لیکن بغیر ابا جان اور گھر والوں کی رائے کے ہیں ----- خیر' چیزیں لینے میں تو انکار نہ تھا ------ مگر میری مادی آنکھوں نے سوٹ کیس کھلنے کے بعد اس میں ایک خوب صورت مردانہ نائٹ سوٹ اور دو ایک الٹی سیدھی چیزیں دیکھ کر پھٹ جانا مناسب سمجھا اور کیا کرتی؟

"کیا آپ کہیں جا رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

وہ ذرا حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگے۔ پھر ہنس دیئے میں بھی ہنس دی۔

بولے "ہاں۔ ایک بے وقوف کے یہاں" اور پھر ہنسے۔ "تم بچہ ہی ہو۔"

انہوں نے کپڑے ہٹا کر ایک قیمتی گھڑی نکال کر میری کلائی پر باندھ دی۔

"آپ آخر" میں نے ذرا حجت کی۔

"تم میری ہو۔" انہوں نے خود مختارئی سے کہا۔ ان کی یہ ادا مجھے بہت پسند تھی۔ بولو!"

"مگر ابا جان کو لکھتے۔" میں نے ان کا بازو تھام کر کہا۔

"ارے!" جیسے وہ اچھل پڑے۔

"بغیر ان کی مرضی کے شادی کیسے ہو سکتی ہے"۔ میں نے گھڑی سے کھیلتے

ہوئے کہا۔

وہ سوچ میں پڑ گئے۔ مجھے بہت دل میں ہنسی آئی۔ عقلمند کہیں کے اس میں سوچ اور فکر کی آخر کیا بات تھی۔ چاہے ابا جان انہیں دل سے پسند نہ کریں۔

"آپ لکھئے' وہ مان جائیں گے" میں نے "نہ" لگا کر پھر زور دے کر کہا۔

"وہ انکار نہیں کرسکتے۔"

"انکار!" وہ بالکل ہی چونک گئے۔

"مگران کی مرضی بغیر شادی۔!"

"شادی؟" ان کے گھٹے گلے سے نکلا اور میں چکرائی "شادی کا کون بے وقوف ذکر کر رہا ہے۔" "پھر---- پھر----؟" میرے پیر کانپ رہے تھے۔

"پھر---- پھر۔" وہ ہنسے۔ زندگی!----- زندگی!----- تم جاہل تو----"

"اور----- اور" میری زبان تالو سے چمٹنے لگی۔

"شادی!" وہ ہنسے "یہ بے وقوفی تو میں کر بھی چکا-----"

میں مجسم سوال بن کر رہ گئی۔ وہ خود ہی بولے۔

"ڈیڑھ مہینہ ہوا------ مجبورا"------- نیلی ہے" وہ اداسی سے ہنسے۔

اور پھر پرانا محل گرتا ہے۔ بڑھیا اپنے برتن بھانڈے اٹھالے۔ اڑ اڑ اڑ دھم۔

میرے تخیل کا بے بنیاد گھروندا ڈھے پڑا۔ ایک دم پھک سے ساری بجلیاں بجھ گئیں۔ اور اس مکروہ اندھیرے میں مجھے ایک ننھے سے بچے کی خاموش چیخیں سنائی دیں۔ جس کے بال اور ہونٹ تاریکی کی وجہ سے صاف نظر نہ آتے تھے۔

اب ان سیاہ بد صورت بچوں کی گوڑی میں ------ مجھے اکثر وہی ننھا سا گھنے گھومے ہوئے بالوں اور بھرے ہوئے خوش رنگ ہونٹوں والا بچہ اپنے سے بہت قریب محسوس ہوتا ---- مگر مختار صاحب کو یہ کیا معلوم!
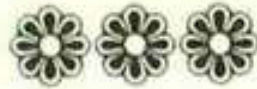
جوانی

جب لوہے کے چنے چب چکے تو خدا خدا کر کے جوانی بخار کی طرح چڑھنی شروع ہوئی---- رگ رگ سے بہتی آگ کا دریا امنڈ پڑا- الھڑ چال- نشہ میں غرق- شباب میں مست- مگر اس کے ساتھ ساتھ کلی پاجامے اتنے چھوٹے ہو گئے کہ بالشت بالشت بھر نیفہ ڈالنے پر بھی اٹنگے ہی رہے- خیر اس کا تو ایک بہترین علاج ہے کہ کندھے ذرا آگے ڈھلکا کر ذرا سا گھٹنوں میں جھول دے دیا جائے ہاں ذرا چال کنگارو سے ملنے لگے گی-

بال ہیں کہ قابو ہی میں نہیں- لٹیں پھسلی پڑتی ہیں- بال بجے جاتے اور مانگ؟ مانگ تو غائب- اگر اماں آٹھویں روز کڑوا تیل چھوڑ کر مینڈھیاں نہ باندھیں تو زندگی اجیرن ہو جائے- گو منہ بے کنگوروں کے طباق کی طرح منڈا منڈا لگنے لگتا ہے' پر بالوں سے تو جان چھٹ جاتی ہے- جیسے کسی نے سر گھونٹ کے بالوں کے وبال ہی سے نجات دلا دی- نہ جانے یہ میمیں پھولے پھولے بال گردن پر چھوڑ کے کیسے جیتی ہیں اور پاؤں؟ پاؤں تو جیسے پھاوڑا- کیا جلدی بڑھ رہا ہے! اگر اسی رفتار سے بڑھا تو سل برابر ہو جائے گا- انگوٹھا جیسے کچھوے کا سر-

اور بھی تھیں بہت سی باتیں جو اکیلے میں بیٹھ کر جنوں کو ستائیں- آئینہ میں ناک دیکھ کے تو بس تے آنے لگتی- یہ ڈبل نگوڑا جیسے کھونٹا- ننھو کی شادی ہوئی تو یہ بڑی سی نتھنی پہنی تھی- اس نے کیا بڑی سی ناک ہے- گڑیا جیسی اور جنو کے کھونٹے پر تو ننھی بھی شرما جائے گی- جب اس کی شادی ہو گی تو؟

"بجلی گرے ایسی ناک پر" اس نے سوچا-

اس پر شبراتی بھیا آئے تھے- کیسے غور سے اس کا منہ تک رہے تھے- بھلا انہوں نے کاہے کو ایسی ناک کہیں دیکھی ہو گی- جنو نے جلدی سے کچھ پونچھنے کے

بہانے ناک اوڑھنی سے چھپالی- شبراتی بھیا جھینپ گئے- سمجھے ہوں گے بگڑ جائے گی-

اے کاش وہ سلوچنا ہوتی' یا مادھوری یا کجن سہی! اللہ میاں کا اس میں کیا جاتا- کچھ ٹوٹا تو آنہ جاتا ان کے خزانے میں- اگر ذرا وہ گوری ہی ہوتی اور کام چور کاریگر ذرا دھیان سے اسے ڈھنگ کا بناتے تو کیا ہاتھ سڑ جاتے ان کے؟

وہ آنکھیں بند کر کے بہت سے فرشتوں کو کھٹا کھٹ انسانی پیکر گڑھتے دیکھتی کاش وہ گڑھی جارہی تھی تو فرشتے کی بغل میں پھوڑا نہ نکلا ہوتا- باپو کے جب پھوڑا نکلا تھا- تو ڈیڑھ مہینے کی کھاٹ گوڑی تھی اور کھرپیا تک نہ ہلائی تھی-

اس کا خیال ماں کی طرف بھٹک گیا- کھپریل میں نہ جانے دن میں کے گھنٹے اینڈتی- پچھلے چند مہینے سے اس کا پیٹ نہایت خوفناک چال سے بڑھ رہا تھا وہ خوب جانتی تھی کہ یہ پھولنا خالی از علت نہیں- جب کبھی ماں پر یہ وبال چھاتا ہے ایک آدھ بہن یا بھائی رات بھر ریں ریں کرنے اور اس کے کولھے پر رونے کو آن موجود ہوتا ہے-

---

مکھیاں' بس دوپہر کو ستاتی ہیں- اس کان سے اڑاؤ دوسرے پر آن مریں- وہاں سے اڑیں تو ناک میں تنتنائیں- وہاں سے نوچا تو آنکھ کے کوئے میں گھس جاتی ہیں- دو گھڑی بھی نہ ہوئی ہوگی کہ دوپٹے کے چھید میں سے یلغار بول دیا اور اوپر سے ماں ڈکرائی-

"موت پڑے تیرے سونے پر' اٹھ' شبراتی کو روٹی دے-"

گردن پر سے میل کی بتیاں چھٹاتی چھینکے کی طرف چلی باہر پتھر پر شبراتی بھیا لال چارخانے کا انگوچھا پچھیج رہے تھے- چھپاچھپ سے میلی میلی بوندیں اچھل کر ان کی ادھ مچی آنکھوں اور الجھے ہوئے بالوں پر پڑ رہی تھیں- وہ روٹی رکھ کے پاس ہی گھٹنے پر تھوڑی رکھ کے غور سے انہیں دیکھتی رہی------ ان کے سینے پر کتنے بال

تھے۔ گھٹنے ہوئے پسینے میں ڈوبے "جی نہ گھبراتا ہوگا۔" وہ سوچنے لگی۔ "کیسی کھجلی پڑتی ہوگی۔" ان کے کسے ہوئے ڈنڑوں اور رمانوں کی مچھلیاں ہر چھپا کے ساتھ اچھلتی تھیں۔

شبراتی بھیا انگوچھا ٹٹی پر پھیلا کر روٹی کے بڑے بڑے نوالے ساگ کی کمی کا گلہ کرتے ہوئے نگلنے لگے۔

"پاڈی" انہوں نے سوکھی روٹی کے محیط نوالے کو گلے میں جکڑتے ہوئے کہا اور جنو نے گھبرا کر انہیں کٹوری پکڑا دی۔

"جلدی سے کھالو۔ کٹوری مانجھ کے یہیں دھر دینا۔ ہمیں کٹی کرنے کو پڑی ہے" وہ غرور سے احکام صادر کرتی اٹھی۔

"ہم کردیں گے کٹی" شبراتی روٹی کے کنارے کھاتے ہوئے بولا۔

"تم کھیت جاؤ گے" وہ چلنے لگی۔

"کھیت بھی جائیں گے" وہ غرور سے ایک ڈکار لے کر بولا۔

"اوہنک رہنے دو۔" وہ چلی۔

"کہتے ہیں تجھ سے کٹی نہیں ہوگی۔ ویسے ہی کوئی چوٹ چپیٹ آجائے گی۔" شبراتی نے پیار سے ڈانٹا۔

شبراتی کو کیا، ان کے آنے سے پہلے وہ کٹی کیا کرتی تھی کہ نہیں۔ ایسی بھی کیا چوٹ چپیٹ۔ چھپر میں جاکر اس نے روپا اور چندن کو پیار سے دو چار گھونسے لگائے اور انہیں کونے میں چپ چاپ کھڑے رہنے کی تاکید کر کے خود کٹی کے گٹھے کو بجور کر گڈیاں بنانے لگی---

"پھیپ ہٹو، ہم کٹی کردیں۔" شبراتی نے پھر ڈکار لے کر چنے کے ساگ کا مزہ لینا شروع کیا۔

وہ اترا کر گنڈاسہ سنبھال کر بیٹھ گئی۔ گویا اس نے سنا ہی نہیں۔

"تجھ سے ایک دفعہ کہو تو سنتی ہی نہیں---- لا ادھر گنڈاسہ۔" وہ گنڈاسہ چھینے لگی۔

"نہیں" وہ ہنسنے لگی- اور کٹی شروع کردی-

"تولیواب-" وہ اپنی پھکنی جیسی موٹی انگلیاں گنڈاسے کے نیچے بچھا کر بولے-

"لیواب کروکٹی---- ماردیو-"

"ہٹاؤ------ کہ ہم سچی ماردیں------" وہ گنڈاسہ تان کر بولی- جیسے سچ مچ مار ہی تو دیتی-

"مار---- تیرے کلیجہ میں بوتا ہو تو مار دیکھ-"

اور جو وہ مار ہی دیتی کچر کچر ساری انگلیاں پس جاتیں- یہ کیا بات تھی، کوئی زبردستی تھی ان کی-

"اب مارتی کیوں نہیں!" شبراتی بھیا نے آنکھیں جھپکائیں----- اور ان کا مونچھوں والا موٹا سا ہونٹ دور تک پھیل گیا- گنڈاسہ چھین لیا گیا---- اور جنو کھسیا گئی- نہ جانے اس کے سخت اور کھردرے ہاتھوں کو اس وقت کیا ہوگیا------ کس قدر چھوٹے اور نرم معلوم دینے لگے-

اسے معلوم ہوگیا کہ سینے پر پسینے میں ڈوبے ہوئے گھنے بالوں سے جی کیوں نہیں گھبراتا اور پھکنی جیسی انگلیاں کیسی پھرتیلی ہوتی ہیں-

---

جنو کا بس چلتا تو وہ ان کے بھوکے کتوں کو اپنی بوٹیاں بھی کھلا دیتی- مگر کتنا کھاتے تھے اس کے ذرا ذرا سے بہن بھائی- وہ موٹی روٹی خواہ کتنی ہی جلی اور ادھ کچری کیوں نہ ہو چٹکیوں میں ہضم کر جاتے- کیا ایسا بھی کوئی دن ہوگا جب اسے روٹی نہ تھوپنی پڑے----- رات بھر ماں آٹا پیستی اور اس بھدی عورت سے ہو ہی کیا سکتا ہے- سال میں تین سو پینسٹھ دن میں کسی نہ کسی بچے کو پیٹ میں لئے کولھے پر لادے یا دودھ پلاتے گزارتی----- ماں کیا تھی ایک خزانہ تھی جو کم ہی نہ ہوتا تھا- کتنے ہی کیڑے اس نے نالیوں میں کشتی لڑنے اور غلاظت پھیلانے کے

لئے تیار کرلئے تھے۔ پر ویسی ہی ڈھیر کا ڈھیر رکھی تھی۔

آخر وہ دن بھی آگیا۔ جب کہ رات کے ٹھیک بارہ بجے ماں نے بھینس کی طرح ڈکرانا شروع کیا۔ محلہ کی کل معزز بیویاں ٹھیکرے اور ہانڈیوں میں بدبودار چیزیں لے کر ادھر سے ادھر دوڑنے لگیں۔ موٹی دوہر کو بچھڑے کی رسی کی مدد سے کھپریل کے کونے میں تان کر ماں لٹا دی گئی۔ بچوں نے منمنانا شروع کیا اور آنے والے سے بڑا بچہ بچھاڑیں کھا کر گرنے لگا۔ باپو نے سب کو عجیب عجیب رشتہ قائم کرنے کی دھمکی دے کر کونے میں ٹھونس دیا اور خود ماں کو نہایت پیچ دار گالیاں دینے لگا۔ جن کا مفہوم جنو کسی طرح نہ سمجھ سکی۔ شبراتی بھیا دو ایک گالیاں جوؤں وغیرہ کو دے کر بھینسوں والے چھپر میں جا پڑے۔ پر جنو ماں کی چنگھاڑیں سنتی رہی۔ اس کا کلیجہ ہلا جاتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کوئی ماں کو کاٹے ڈال رہا ہے۔ عورتیں نہ جانے اس پردے کے پیچھے اس کے سنگ کیا بے جا حرکت کر رہی تھیں۔ جنو کو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے ماں کا سارا دکھ وہی اٹھا رہی ہے۔ گویا وہی چیخ رہی ہے اور ایک نامعلوم دکھ کی تھکن سے وہ واقعی رونے لگی۔

صبح کو وہ ایک سرخ گوشت کے لوتھڑے کو گودڑ میں رکھا دیکھ کر قطعی فیصلہ نہ کر سکی کہ اس مصیبت اور دکھ کا معقول صلہ ہے یا نہیں جو ماں نے گزشتہ شب جھیلا تھا۔ پتہ نہیں ماں نے دوسری غلاظت کے ساتھ ساتھ اسے چیلوں کے کھانے کے لئے کوڑے کے ڈھیر پر رکھنے کے بجائے اپنے کلیجے سے کیوں لگا رکھا تھا۔

جاڑوں میں بھینسوں کے گوبر کی سڑاند بچی کھچی سانی کی بو کے درمیان پھٹے ہوئے گودڑ میں اس سرے سے اس سرے تک جیو ہی جیولیٹ جاتے۔ پھٹی ہوئی روئی کے گتھل اور پرانی بوریاں جسم کے قریب گھسیٹ کر ایک دوسرے میں گھسنا شروع کر دیتے تاکہ کچھ تو سردی دبے۔ اس بے سروسامانی میں بھی کیا مجال جو بچے نچلے بیٹھیں۔ رسولن ہنگوا کی ٹانگ گھسیٹتی اور نتھو موتی کے کولھے میں کاٹ کھاتا اور کچھ نہیں تو شبراتی ہی گھسیٹ کر اتنی گدگدی کرتا کہ سانس پھول جاتی وہ تو جب ماں گالیاں دیتی تب ذرا سوتے۔ رات کو وہ افراتفری پڑتی کہ کسی کا سر تو کسی کا پیر۔

کسی کو اپنے جسم کا ہوش نہ رہتا۔ پیر کہیں تو سر کہیں۔ بعض وقت اپنا جسم پہچاننا دشوار ہو جاتا۔ رات کو کسی کی لات یا گھونسے سے چوٹ کھا کر یا ویسے ہی اتنے جسموں کی بدبو سے اکتا کر اگر کوئی بچہ چوں بھی کرتا تو ماں ڈائن کی طرح آنکھیں نکال کر چیختی اور فریادی بسور کر رہ جاتا اور جنو تو سب سے بڑی تھی۔

مگر جنو کو خوب معلوم ہو گیا کہ سینے پر کتنے ہی بال ہوں اور بغل میں سے کیسی ہی سڑاند آئے جی بالکل نہیں گھبراتا۔ موری کا کیڑا کیچڑ میں کیا مزے سے لوٹتا ہے اور اس میں بات ہی ایسی کیا تھی۔

جب دوپہر کو ماں بچے کو جنو کو دے کر دائی سے پیٹ ملوانے کوٹھری میں چلی جاتی یا اپنی سہیلیوں سے کوئی نہایت ہی پوشیدہ بات کرتی ہوتی تو وہ بھیا کو گود میں لٹا کر جانے کیا سوچا کرتی وہ اس کا چھوٹا سا منہ چومتی۔ مگر اس کا جی متلانے لگتا۔ پلپلا پلپلا۔ سڑے ہوئے دودھ کی بو۔ وہ سوچنے لگتی کہ کب وہ چھ فٹ اونچا چوڑے بازوؤں والا جوان بن چکے گا---- اور پھر وہ اس کی چھوٹی چھوٹی مونچھوں اور پھکنی جیسی موٹی موٹی انگلیوں کا تصور کرتی۔ اسے یقین نہ آتا کہ کبھی یہی خمیری گلگلا لکڑی کا کھمبہ بن جائے گا۔

کنوئیں پر نہاتے ہوئے نیم برہنہ غنڈوں کو دیکھ کر وہ اپنے آدھ مرے بھائیوں پر ترس کھانے لگتی۔ کاش یہی بڑھ جائیں۔ اتنا کھاتے ہیں پھر کچریا سا پیٹ پھول جاتا ہے۔ اور وہ بھی صبح کو خالی۔

محرم پر شبراتی بھیا اپنے گھر چلے گئے۔ رات کو بچے پہلی ہی دھتکار میں سو جاتے۔ پر جنو پڑی پڑی جاگا کرتی---- وہ سرک سرک کے کسی بچے سے بے اختیار ہو کر لپٹ جاتی۔

"شبراتی بھیا کب تک آئیں گے اماں؟" اس نے ایک دن پوچھا ماں سے۔

"بیساکھ میں اس کا بیاہ ہے اب وہ سسرال ہی رہے گا" ماں گیہوں پھٹکتے ہوئے

بولی۔ "ارے"

اسے کس قدر حیرت ہوئی۔ گھسیٹے چاچا کے بیاہ میں بس کیا بتایا جائے کیا مزہ آیا تھا۔ رات رات بھر بس گانا اور ڈھول۔ سرخ ٹول کی دوپٹیا وہ کس شان سے آٹھ دن تک اوڑھے پھری تھی۔ جبھی تو شبراتی بھیا نے اس کے کیا زور سے چٹکی بھرلی تھی۔ وہ گھنٹوں روئی تھی وہ پھر سوچنے لگی کہ بیاہ میں وہ کونسا کرتا پہنے گی۔ لال اوڑھنی تو ویسی دھری تھی، پھر بیاہ تو ابھی دور تھا۔

پر نہ جانے اسے کیا ہو گیا تھا۔ ویسے تو کچھ نہیں۔ پر جی تھا کہ لوٹا جاتا تھا اگر پچھواڑے املی کا پیڑ نہ ہوتا تو وہ پھر بھوکی ہی مرجاتی۔ کیسا جی بھاری بھاری رہتا---- ماں اس کے جھونٹے پکڑ پکڑ کر ہلاتی۔ پر ہر وقت نیند تھی کہ سوار رہتی----- پانی بھرتے میں اسے کئی دفعہ چکر آگیا اور ایک دفعہ تو وہ گر ہی پڑی دہلیز پر۔

"ناجو کی کمر لچک جاتی ہے" ماں نے دو ہنٹر مار کر کہا۔

اور اپنا پیلا چہرہ دیکھ کر تو وہ خود ڈر جاتی۔ وہ یقیناً" مرنے والی ہو رہی تھی۔ کبڑی بڑھیا مری تھی تو کئی دن پہلے دھڑام سے موری میں گری اور بس گھسٹا ہی کرتی تھی۔

"اری یہ تجھے ہو کیا گیا ہے رانڈ؟" ماں نے اسے پژمردہ دیکھ کر پوچھ ہی لیا۔ اور وہ اسے بے طرح ٹٹولنے لگی۔ جنو کے بہت گدگدی ہوئی۔

"حرام زادی! یہ کس کا ہے؟" اس نے اس کی چوٹی اینٹھ کر کہا۔

"کیا؟" جنو نے ڈر کر پوچھا۔

"ارے---- یہی----- تیرے کرتوت----- بچہ بنتی جاتی ہے------ مردار، حرام خور۔" اس نے جنو کو اتنا مارا کہ ڈھائی سیر گھی پھینکنے پر بھی نہ مارا ہوگا اور خود اپنا سر کوٹ ڈالا۔

"اری مردے خور بتا تو آخر کچھ!" وہ تھک کر جنو کو پھر پیٹنے لگی۔

اور پھر اس نے نہ جانے کیا کیا پوچھ ڈالا۔ وہاں تھا ہی کیا۔

رات کو اسنے اپنے باپ کی گالیاں اور مار ڈالنے کی دھمکی سن کر زور سے گھٹنے پیٹ میں اڑا لئے اور کھاٹ پر اوندھی ہو گئی۔---- پر اسے بڑی حیرت ہوئی کہ وہ ساتھ ساتھ شبراتی بھیا کو کیوں گنڈاسہ سے کاٹ ڈالنے کی دھمکی دے رہے تھے۔ بیساکھ میں تو ان کا بیاہ ہونے والا تھا۔ جس میں وہ سرخ دوپٹہ اوڑھ کر---- اس کا گلا بھر آیا۔

❀❀❀

ڈائن

حامد نے جو قمیض صندوق سے نکالی' اس کے بٹن ٹوٹے ہوئے تھے- کسی میں آدھا بٹن لٹک رہا تھا کسی میں پون' اور باقی ایک سرے سے غائب- جی جل کر خاک ہوگیا- بے اختیار جی چاہا کہ جاکر دھوبن کے کس کس کر ٹھوکریں مارے کے بس یاد ہی کرے- مگر کلب کا وقت قریب تھا- دوسرے صرف دھوبن کو ٹھونکنے کے لئے اس کے گھر اتنی دور جانا محض حماقت تھی سامنے اس کی تندرست بیوی رضیہ سونے کے لئے تیار پلنگ پر چڑھی لیٹی تھی- اس نے سوچا' لاؤ خود ہی ٹانک لوں- یہ باس دو ہی تو بٹن ہیں- گریبان میں' اور--- ایک کف میں- مگر ارے! تیرے پر سے بھی تو ذرا مسک گیا تھا کپڑا- آخر حق شوہر بھی کوئی چیز ہے- کیوں نہ رضیہ ہی کو تکلیف دی جائے لہٰذا اس نے پکارا:

"رضیہ---- اے رضیہ----- ذرا اٹھو تو"

"کیا ہے بھئی!" رضیہ ٹھنک کر بولی-

"ارے بھئی ذرا---- یہ دیکھو دھوبن چڑیل سارے بٹن توڑ لائی- یعنی یہ بھی کوئی بات ہے کہ ایک بٹن بھی نہیں چھوڑتی- اٹھو ذرا بٹن لگا دو اور ہاں یہ تیرے کے پاس سے ذرا سی ادھڑ گئی ہے' یہ بھی سی دو-

"اچھا' ابھی سیئے دیتی ہوں-" رضیہ نے کروٹ بدل کر پھر سونے کے لئے کنڈلی مارلی-

"تو پھر اٹھو نا- بھئی مجھے کلب جانا ہے" وہ اسکا کندھا ہلانے لگا-

"اماں جان سے کہئے نا- وہ سی دیں گی- اب اس وقت میرے پاس سوئی دھاگا بھی تو نہیں-" یہ کہہ کر وہ مکھیوں سے بچنے کے لئے دوپٹے میں چھپ گئی-

اماں جان کا نام سن کر حامد کا منہ اتنا سا نکل آیا- بھلا یہ بھی کوئی انصاف ہے-

دنیا جہان کی بیویاں اپنے میاؤں کی قمیضوں میں بٹن ٹانکتی ہیں۔ آخر رضیہ کونسی زالی ہے جو دو بٹن بھی نہ ٹانک سکے۔ آخر ہر کام کے لئے وہ اماں جان سے کیوں کہے۔ آخر بیوی رکھنے کا پھر فائدہ ہی کیا' جب کہ ہر کام اماں جان وقت سے پہلے ہی کر کے رکھ دیتی ہیں اور جو ذرا سا کام کرنے کو کہو رضیہ پر سستی سوار ہو جاتی ہے۔ وہ ذرا منہ پھلا کر بولا۔ "نہیں' ہر کام بس اماں جان سے کرالو۔ آخر کیوں "اور جو تم کردو گی تو کیا ہو جائے گا؟"

"اب میں ذرا سو رہی ہوں۔" وہ پیار سے بولی۔

حامد جانتا تھا کہ جب رضیہ سستی کرنے لگے تو بس اس کا ایک علاج ہے اور وہ یہ کہ گدگدیاں ---- فورا" نیند وینڈ بھاگ جاتی تھی۔ چنانچہ اس نے قمیض کو تو کرسی پر ڈالا اور ---- بس۔

"اٹھو ---- اٹھو ---- بس پھر اٹھو ----"

"رضیہ ہنسی سے بیتاب ہو کر لوٹ گئی۔

"اچھا ---- ہی ---- ہی ---- آہ ---- اچھا تو چھوڑیئے تو۔" وہ مرغ بسمل کی طرح تڑپ کر بولی۔

"چھوڑیئے نہیں ---- بس سیدھی طرح اٹھو۔" وہ بھی ہنستے ہوئے بولا۔

"اماں جان برآمدے میں عصر کی نماز پڑھ رہی تھیں۔ بٹنوں کا قصہ سن کر وہ جلدی جلدی سلام پھیر' چپٹی سلیم شاہی جوتی پیروں ہی سے گھسیٹتی ہوئی لپک کر آئیں۔ نماز کے بعد دعا کے بول اب تک ان کے ہونٹوں پر منڈلا رہے تھے اور دوپٹہ ڈھاٹے کی طرح ٹھوڑی پر کسا ہوا تھا۔

"لاؤ بیٹا میں ٹانک دوں بٹن ---- میں نے تو اس سے کئی دفعہ کہا کہ بٹی جیسے ہی دھوبن کپڑے لایا کرے مجھے دے دیا کر۔ نک سک سے درست کر کے رکھ دیا کروں مگر بھول جاتی ہے۔ لاؤ کہاں ہے قمیض؟"

حامد کھسیانا ہو گیا۔ بولا۔ "رہنے دیجئے ---- آپ کیوں تکلیف کریں۔ آخر رضیہ جو ----"

"اوئی بچے اس میں تکلیف کاہے کی----- اب میں ہی جو ٹانک دوں گی تو کیا موئے ہاتھ گھس جائیں گے میرے؟ اور بیٹا- میری تو دعا ہی ہے- تمہارے سرے کو اللہ بخشے کبھی شکایت نہ ہوئی- جیسے ہی دھوبن آئی بس میں سب کپڑے لتے لے کر بیٹھ جاتی- اور سب ٹھیک ٹھاک کر پیوند پارے سے درست کر ان کے بکس میں رکھ دیتی---- یہ رضیہ---- بھئی ابھی کم سن ہے نا-"

بس حامد کے پیروں سے آگ لگی تو سر پر ہی جاکر شاید بجھی ہو- کلس کر رہ گیا- رضیہ کو کم سن سمجھنے میں نہ جانے بڑی بی کو کیا مزہ آتا تھا- اپنے چار برس کے نواسے کو تو وہ نظرانداز ہی کر جایا کرتی تھیں- خیر حامد تو منہ لٹکائے نہانے چلا گیا- جب وہ واپس آیا تو اس نے دور ہی سے پکارا-- رضیہ ہی کو پکارا-

"رضو! بٹن ٹانک دیے---- لاؤ قمیض----!"

"ہاں بیٹا----- لو------ رضیہ ذرا غسل خانے گئی ہے- اور کوئی کپڑا ہو تو دیدو- ٹھیک کردوں-"

حامد نہ جانے کیوں چڑ گیا- گو جس کام کو وہ زبان سے نکالتا بڑی بی لپک کر کردیتیں- پھر بھی اسے ضد تھی کہ کرے تو رضیہ ہی کرے- جب بن ٹھن کر وہ کلب جانے لگا تو رضیہ ہی کو پکارا----- بڑے پیار سے پکارا-

"رضو---- ذرا ایک اچھا سا پان تو لگا دو-"

"ہاں ہاں ابھی لو بیٹا-" اور اماں جان کے دو سوکھے ہاتھوں نے جھٹ پٹ ایک آدھ مری، جی ہاں آدھ مری سی- چونکہ سوکھے سوکھے ہاتھوں سے تروتازہ سی گلوری بھی کچھ یوں ہی سی معلوم ہوتی ہے- ہاں تو جلدی سے گلوری پیش کردی-

حامد نے ایک ٹھنڈی سانس بھری- جب سے اس کی شادی ہوئی تھی- وہ انہیں سوکھے جھرکٹ ہاتھوں کی بنائی ہوئی گلوری کھایا کرتا تھا- خیر اس نے جیسے اتنے دن صبر کیا اور کچھ دن کرے گا- آخر کبھی تو یہ سوکھے مارے ہاتھ تپش پاکر آرام کی نیند سوئیں گے- اور پھر؟ پھر وہ موٹے موٹے سفید ہاتھوں کی بنائی تروتازہ گلوریاں کھایا کرے گا- اس آنے والے خوشگوار وقت کے خیال سے ہی وہ مسکرا

اٹھا۔ اس نے ان موٹے سفید ہاتھوں کی مالکہ کی طرف عجب انداز سے دیکھا۔ جو مکھیوں سے بچنے کے لئے دوپٹے میں چھپی ہوئی تھی۔ اس نے آہستہ سے دور ہی سے کہا۔

"خدا حافظ رضو"

"جیتے رہو بیٹا۔" چہیتی ساس نے جواب دیا۔ اور پلانوں کی صافی سے ناخون پونچھنے لگیں۔

حامد چڑ گیا۔ او نہ' وہ تو رضو ہے۔ خیر وہ چلا۔

"منیر دولھا" اس کی ساس نے پکارا۔

حامد کا جی چاہا۔ ٹینس کا ریکٹ کسی کے زور سے کس کے مارے اور بچوں کی طرح زمین پر مچل کر خوب لوٹے۔ آخر بڑی بی اسے چھیڑنے پر کیوں تلی رہتیں کاش وہ اب اسے منیر دولھا نہ کہا کرتیں۔ دولھا بنتا ہے انسان دو ایک روز کے لئے وہ بھی بارے باندھے سے۔ اور یہاں چھ سال شادی کو ہونے آئے۔ اماں جان کے شاعرانہ تخیل میں اس کی حیثیت "دولھا" ہی جیسی تھی۔ لفظ دولھا اسے اپنی اس مسخری تصویر کو سامنے لاکر کھڑا کردیتا تھا۔ جس سے اسے چڑ تھی۔ ظفر محمود' افضل سب ہی کی شادیاں ہوئی تھیں۔ پر ان میں سے کوئی بھی دولھا نہیں کہلاتا تھا۔ وہ سب اسے چھیڑنے کو اکثر دولھا میاں کہہ کر ٹھٹھا مارا کرتے۔ اگر دنیا میں دولھا کہنے والی ساسوں کا وجود اس قدر ضروری تھا تو پھر خدا نے اس قدر شریر دوست ہی کم از کم نہ پیدا کئے ہوتے۔ خیر وہ آہستہ سے بغیر مڑے بولا "جی۔"

"میاں رات کو ذرا جلدی آجایا کرو۔ بچی اکیلی پڑی دہلا کرتی ہے۔"

"نو بجے سے پہلے ہی آجاتا ہوں۔ او نہ! وہ دور ہی سے بولا۔

"ہاں ---- آخر۔ یہ میں کب کہتی ہوں۔ مگر میاں آخر کو بچی ہے۔ اکیلا ڈھنڈار گھر میں چولہے کے پاس لگی رہتی ہوں (رقت کی دھمکی دے کر) تم جانو تمہاری بیوی ہے۔ مجھے اپنی مامتا۔" آگے وہ کچھ نہ بولیں۔ حامد منہ پھلائے چلا گیا۔ اگر اس کی بیوی اپنی معصوم آنکھوں سے اسے ایک بار دیکھ کر جھوٹ موٹ ہی کو

کہہ دیتی تو وہ کلب ولب پر لات مار کر آج تو ضرور ہی گھر میں بھی بیٹھتا۔ مگر اب تو اسے جانا ہی پڑا۔

نہ جانے حامد کو کیا ہوگیا تھا۔ بے وقوف انسان نہ جانے کیا سمجھتا تھا' بالکل دماغ ہی چل گیا تھا۔ جیسے۔ آخر بڑی بی سے چڑنے کی اسے کیا مار تھی۔ وہ اس کی اور اس کے گھر بار کی دیکھ بھال ایسے کرتی تھیں کہ بس کیا کوئی دوسرا کرے گا۔ وقت پر کھانا چائے۔ ہر چیز اپنی جگہ قرینے سے' ہر کام ٹھیک--- پھر؟ پھر آخر وجہ اس طرح منہ سجانے کی؟ آخر اماں جان سے بڑھ کر اس کا اور اس کی بیوی کا کون ہمدرد تھا؟ رضیہ ابھی نا تجربہ کار تھی۔ پر وہ زمانے کا رنگ ڈھنگ دیکھے ہوئے تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ آج کل کے شوخ طبیعت لڑکے سیدھی سادی لڑکیوں کے بوتے کے نہیں ہوتے۔ انہیں تو چٹاخ پٹاخ اور شوخ سلیقہ لڑکیاں ہی قابو میں رکھ سکتی ہیں۔ وہ رضیہ کو باقاعدہ فیشن کے مطابق بنائے سنوارے رکھتیں۔ گھر کا سارا کام کاج خود کرتیں کہ کہیں میلی کچیلی لہسن پیاز میں بسی ہوئی بیوی کو دیکھ کر حامد "بدکنے" نہ لگے۔ انہوں نے اسے بال بچوں کے جھگڑے سے بھی آزاد رکھا۔ وہ اسے محسوس ہی نہ ہونے دیتی تھیں کہ وہ ایک بچے کی ماں بن چکی ہے۔ وہ بچے کو اپنے ہی پاس رکھتی تھیں۔ کہ کہیں اس کے رونے دھونے سے حامد گھبرا نہ اٹھے۔ بچے عورت کا حسن لوٹ لیتے ہیں۔ اور اس میں شوہر کو لبھانے والا جادو نہیں رہتا۔

حامد جب کلب سے لوٹا تو وہ جان بوجھ کر دیر سے آیا۔ وہ دکھا دینا چاہتا تھا کہ وہ بڑی بی سے قطعی نہیں دبتا اور کس آزادی سے ان کی عدول حکمی کر سکتا ہے۔ وہ دل میں ٹھان کر آیا تھا کہ اگر آج اماں جان نے کوئی ذرا سی بھی بات اسے جلانے کو کہی تو بس ٹوٹ پڑے گا۔ مگر جب کمرے میں داخل ہوا تو اس کی نظر رضیہ پر

پڑی- وہ سرمئی رنگ کی ساڑھی میں ریشمی بلی کی طرح کرسی میں گیند بنی پڑی تھی- وہ بے ساختہ مسکرا اٹھا- اور لڑائی کا خیال ایک سرے سے اس کے دماغ سے نکل گیا وہ اس کے قریب ہی بیٹھ گیا اور بڑے سپاہیانہ انداز میں ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا-

"اوہ----- رضو' آج بشن چند کو بری طرح مارا- یقین مانو---- دو سے' یہ دیکھو---- یہ موچ آگئی آج ہاتھ میں-"

رضیہ کلبلا کر اٹھنے لگی "اے ہے یہ کیسے؟ لایئے آیوڈیکس مل دوں!"

"اوہو---- یہ قسمت اور ہماری-" وہ اپنی دکھتی ہوئی کلائی کو موڑنے کی کوشش کرتے ہوئے حسرت سے بولا- گویا یہ بھی خوش قسمتوں ہی کو نصیب ہوتا ہے کہ ان کی کلائیوں میں موچیں آئیں اور ان کی حسین بیویاں آیوڈیکس ملیں"

رضیہ ہنس دی-

"اب اترایئے مت!--- لایئے کہاں ہے آپ کی اٹیچی----- اسی میں ہوگا- آیوڈیکس!"

"آیوڈیکس بعد میں ملنا---- ذرا پہلے میرے پاس آؤ---- ادھر میرے پاس--- اونہ' ذرا قریب آؤ----- آؤ تو----- او ہو------ آج بس----- اور ہاں تم نے میری پسند کی سرمئی ساڑھی پہن ہی لی؟" وہ اطمینان کی سانس لے کر بولا-

"ہٹیے بھی" وہ شرمانے سی لگی-

"اور---- آؤ مگر!" وہ ایک دم سے چپ ہوگیا- جیسے ٹھوکر کھا کر اوندھے منہ گر پڑا-

"کیوں---- آخر کیا" وہ قریب آکر بولی-

"رضیہ----- یہ جمپر----- یہ اودا جمپر----" وہ جذبات سے مغلوب ہو کر ہکلایا-

"یہ اودا ہے! واہ سبز ہے یہ تو" رضیہ بولی-

"گہرا سبز ہو گا- مگر وہ سرخ جمپر کیوں نہ پہنا------ وہ جو میں لایا تھا"-
حامد ایسے بولا گویا یہ کوئی اہم ہی مرحلہ ہے- جسے وہ طے کر کے رہے گا-
رضیہ معصومیت سے بولی- اماں نے کہا کہ یہ کلیجی بھبھرا برا لگتا ہے- سبز خوب کھلتا ہے- سرمئی ساڑھی پر------ اور------"
"اور وہ چوڑیاں------ نیلی------؟"
"وہ رکھی ہیں"------ اماں جان نے کہا "پرانے فیشن کی ہیں' اب کے منہیاری آئے تو اس سے بدل لینا- وہ آئی نہیں ابھی تک' میں نے یہ دوسری ڈال لیں-"
"کیوں آخر ان چوڑیوں میں بھی برائی پیدا ہو گئی!"
"برائی کیوں پیدا ہو جاتی' وہ ذرا ولیّ تھیں یہ نئے فیشن کی ہیں-"
حامد اماں جان کے نادر شاہی حکموں کو سن کر پست ہو گیا- اس کا دوڑتا ہوا خون جیسے سونے لگا- اس کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے نتھنے ہلنے لگے اور گلے میں سوکھی سوکھی گولیاں سی اٹکنے لگیں- یہ ہتک کی جاتی تھی اس کے لائے ہوئے محبت کے تحفوں کی- بھلا اس کی پسند اور کلیجی بھبھرا- بھلا وہ چوڑیاں لائے اور پرانے فیشن کی- یہ عقل میں آنے والی بات ہے- بھلا ہو کیسے سکتا ہے- یہ سب حامد کو جلانے کے لئے سازش کی گئی ہے- وہ سمجھ گیا اور رنجیدہ ہو کر بولا- "نئی وضع یا پرانی وضع---- میری لائی ہوئی کوئی چیز بھی تمہیں پسند آئی ہے- کبھی میری پسند کا بھی تم نے کپڑا پہنا؟ کہ بس جو چیز ہے اوروں کی پسند کی- جو کام ہیں اوروں کی مرضی کے مطابق ہیں- میں نے مانا کہ اس گھر میں میری حکومت نہیں- اماں جان کی حکومت چلتی ہے- مگر میں بھی تو آخر کوئی چیز ہوں- اتنے دن شادی کو ہو گئے- یہی پتہ نہیں چلتا کہ یہ گھر ہے یا سرائے! جو چیز ہے اوروں کے ہاتھ میں یہاں تک کہ بیوی بھی!"
اماں جان گھنٹوں رضیہ کو لیکچر پلاتی تھیں- گھنٹوں زمانہ کی اونچ نیچ سمجھاتی تھیں- مگر وہ اس کے منہ میں کترنی جیسی زبان تو نہ رکھ سکتی تھیں- وہ تھی جیسے گودڑ- پھر بھی اس نے کہا "اماں جان اتنی محبت کرتی ہیں' پھر ان کا دل!"

"ان کا دل! ان کا دل !!گویا میرے تو دل نہیں پتھر کا ٹکڑا ہے سینے میں۔ چاہے جتنی ٹھوکریں مارو نہیں ہوتا کچھ۔ تم میری بیوی ہو یا اماں جان کی؟"

"آپ تو غصے ہونے لگے۔ ذرا دیکھئے وہ کس قدر محبت سے گھر کا انتظام کرتی ہیں۔ اچھے سے اچھا کھانا۔ وقت پر------ تمام------"

"تو گویا مجھے اچھے اور وقت پر کھانے کے سوا اور کچھ نہیں چاہیے مجھے بھی گھوڑا سمجھا ہے کہ وقت پر دانہ پانی دے دیا اور بس!------ واہ خوب! کیا سمجھا ہے تم نے مجھے۔"

بہت خوب!

"مگر وہ نموان سے کس قدر ہلا ہوا ہے، ہمیں تو وہ جانتا بھی نہیں ہے۔ انہی کو ماں سمجھتا ہے۔"

"یہ اور بھی کمال ہے۔ بھیا یہ بھی کوئی خوشی کی بات ہے کہ ہمارا بچہ ہمیں کچھ نہیں سمجھتا۔ خوب!

"ان کی محبت اور-----"

"ارے بھئی باز آئے ان کی محبت سے کہ بس وبالِ جان۔"

"یہ آپ----" رضیہ رونے کی دھمکی دینے لگی۔

حامد ڈرا اور دوسرے اس نے آنے والے قدموں کی چاپ بھی سن لی تھی۔

اماں جان آکر پیار سے بولیں۔ "آج کیا کھانا نہیں کھایا جائے گا۔"

"ابھی چلتے ہیں۔ ذرا ان کے ہاتھ میں چوٹ لگ گئی ہے۔ آئیوڈیکس مل دوں تو ابھی آتی ہوں۔" رضیہ بولی۔

"اے ہے کاہے سے" بڑی بی چیخ کر بولیں۔

"ٹینس کھیلنے میں ہاتھ مڑ گیا---- ننھے کو دی تھی میں نے ڈبیہ رکھنے کو۔" رضیہ نے جواب دیا۔

"اے نگوڑے ٹینس پینس یہ کیا کھیل نکلے ہیں کہ ہاتھ پیر سلامت نہ رہیں۔ جبھی تو میں کہتی ہوں میاں ان واہیات کھیلوں کو لات مارو۔ نگوڑے بے کار اے بھئی اپنا گھر بار ہے، یہاں ہی شام کو اٹھو بیٹھو۔ چوسر ہے، تاش ہے وہی کھیلو۔"

بڑی بی کی نصیحت سے حامد رونکھا سا ہوگیا۔ اب زیادتی پر ہی تل گئیں۔ بھلا گھر میں بیٹھ کر ان آندھی چندھی کے ساتھ کیا تاش اور چوسر کھیلے۔ پتے یہ نہ پہچانیں۔ میم اور غلام کا فرق انہیں نہیں معلوم۔ گھنٹوں گھور گھور کر دیکھنے کے بعد بھی آج تک ٹھیک چال چل کر نہیں دی خدا کی بندی نے اور اوپر سے۔ اونہہ۔ وہ دل ہی دل میں گھنڑیاں کھولتا۔

"اے ننھے! وہ ذرا ڈبیہ تو لا۔" رضیہ نے پکارا۔

"کون سی ڈبیہ؟ وہ مرہم کی----- اے میرے پاندان میں ہے۔ اے ننھے او ننھے کے بچے۔ کان پھوٹ گئے یا سوگیا چولھے پر؟ چل ادھر۔"

"کیا ہے بی؟" ننھا آٹے بھرے ہاتھوں سے سر کھجاتا آیا۔

"اے وہ میری ڈبیہ ہے کہ نہیں۔ وہ تو لے آ۔"

"کون سی ڈبیہ؟"

"اے وہی پاندان میں جو پڑی ہے۔ میں نے اس دن پلنگ کے نیچے سے اٹھا کر رکھ لی تھی۔ میری پٹاری میں ہوگی۔"

"کون سی پٹاری میں؟"

"اوئی۔ اے پانوں کی اور کیا سینے کی پٹاری میں۔ پلنگ پر رکھی ہے۔ برآمدے میں۔"

"کون سے پلنگ پر؟"

"اے مارے گئے تنگیاں چھانٹ رہا ہے کہ---- لاتا ہے اب ڈبیہ! اے نواڑ کی پلنگڑی پر میری پٹاری رکھی ہے۔"

"نواڑی پلنگڑی پر۔" ننھا ہزاروں سوالوں کے بعد بھی کچھ نہ سمجھ کر بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔ حامد کا جی خوش ہوگیا کہ ننھے نے اماں جان سے اس کو ستانے کا کچھ نہیں تو ذرا سا بدلا تو لے ہی لیا۔ ننھا ہزار مصیبتوں کے بعد ڈبیہ لایا تو بڑی بی آستین چڑھا کر آگے بڑھیں۔

"لاؤ میاں میں مل دوں!"

"نہیں، رہنے دیجئے، کچھ ایسی زیادہ تو چوٹ بھی نہیں---- رضیہ مل دیتیں----"

"اے نہیں، میں مل دوں گی، اس میں ہے ہی کیا۔"

لاکھ جتن کر کے ڈبیہ کھولی۔ اندھیرے میں سوجھتا نہیں۔ پھر بھی ٹٹول رہی ہیں۔ حامد بھی منہ پھیر کر بیٹھ گیا۔ اسے کیا غرض تھی کہ مدد کرتا۔ خیر ڈبیہ کھلی اور انہوں نے سیاہ مرہم کی لگدی اس کی کلائی پر رکھ کر گھسے دینے شروع کئے۔

آج آئیوڈیکس بھی حامد کو چھیڑ رہا تھا۔ کمبخت گوند کی طرح چپکا جاتا تھا اور اوپر سے ان سوکھی انگلیوں کی گرفت---- درد بجائے گھٹنے کے اور بڑھا اور بڑھتے بڑھتے دل و دماغ پر پھیل گیا۔ بڑی بی نے جیسے لوریاں دینی شروع کیں۔

"ایک دفعہ تمہارے سسر کو اللہ بخشے چوٹ آگئی تھی۔ ہاتھ سوج کر یہ دنبل کا دنبل ہو گیا۔ میں نے جھٹ بی ہمسائی سے تھوڑی افیم لے ذرا سے بھیلی کے تیل میں ڈال، گرم کر مالش کر دی۔ اوپر سے سینکتی ڑوئی باندھ دی۔ اے لو وہ تو تین دن میں اچھے بھلے ہو گئے ویسے سادہ تیل بھی اچھا ہوتا ہے۔ بات یہ ہے نگوڑا یہ مرہم ہے کیسا۔ سارا چمٹا جارہا ہے انہوں، اور بو تو دیکھو حقے کی سی سڑاند ہے توبہ۔ توبہ" وہ زمین پر تھوک کر بولیں۔

"یہ آپ نے کیا مل دیا" حامد چڑ کر بولا اور ہاتھ کھینچ لیا۔

"اے وہی، کیا ہووے ہے مرہم اور کیا؟"

"یہ مرہم ہے یا تمباکو کا قوام؟---- لاحول ولا قوہ۔"

"اے ہے مجھ اندھی کو سوجھتا بھی نہیں----- مگر شاباش ہے میاں عینک لگائے ہو۔ ماشاء اللہ! تمہیں بھی دکھائی نہ دیا کہ یہ کیا بلا ہے۔ واہ میاں واہ----"

رضیہ ہنسنے لگی۔

"اے ہے یہ تمباکو---- اونہہ------ لائیے آپ کا ہاتھ دھلا دوں، توبہ ہے بو تو دیکھو۔"

"خاک دھلاؤ گی۔ معاف کرو۔" حامد ہاتھ چھڑا کر پیر پٹختا غسل خانے میں چلا گیا۔ اس دن اسے تلے ہوئے گرم گرم کباب اور مٹر پلاؤ جس پر اس کی جان جاتی تھی خاک مزے دار نہ معلوم ہوا۔ وہ انہی بے رحم ہاتھوں کا ہی تو پکا ہوا تھا، جنہوں نے اس کی نفیس کلائی پر بجائے آئیوڈیکس کے قوام کی مالش کی تھی۔ رات کو دیر تک وہ بچھونے پر لوٹتا رہا۔ کیونکہ قوام کی بو ایسی بس گئی تھی کہ اسے نیند نہ آئی۔

ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو ہر شوہر خواہ وہ کتنا ہی بے ہنگم بڑی توند والا اور بدشکل کیوں نہ ہو جب تنخواہ لے کر آتا ہے تو عین مین کوہ قاف کی پری معلوم ہوتا ہے بیس تاریخ سے قرض پر گزارا کرنے والی بیوی کا جی چاہتا ہے کہ بس اس خزانہ کی کنجی کی بلائیں لے کر واری نیاری ہو جائے اور بھئی بچارے میاں کا بھی ایک یہی دن جوبن اور بھکار کا ہوتا ہے وہ اس دن خواہ مخواہ ذرا اچک کے چلتا ہے، گویا اونچی ایڑی کی گرگابی پہنے ہو۔ جب حامد تنخواہ لے کر آیا تو رضیہ کے پُر سکون نیم غنودگی کے انداز میں ذرا ہلچل نہ مچی۔ وہ ویسے ہی دیوار سے تکیہ لگائے اپنے خوبصورت شفان کے دوپٹے پر پچرنگی دھاریاں گنتی رہی۔ حامد ذرا کھڑا ہوگیا۔ اس نے رضیہ کو جگانے کے لئے آخر کہہ ہی دیا کہ "لو بھئی رضو! حساب کتاب کرلو۔۔۔"

"ہوں۔۔۔۔۔ آ۔۔۔۔۔ خ۔۔۔۔۔ خاؤ۔۔۔۔۔" اس نے لاپروائی سے جمائی لی۔

"اور بھئی بزاز کے کتنے دام ہوں گے؟ اب اٹھو بھی کہ بس۔۔۔۔ او نہ۔"

"شاید اس دفعہ تو کم ہی ہوں گے۔۔۔۔ اماں جان کو شاید معلوم ہو۔"

"اور بنئے کے؟"

"اس کے تو شاید۔۔۔۔ چکا دیئے گئے۔۔۔۔ اور نقد آتی ہے جنس!"

"یہ شاید" اور "ہوں گے" حامد کے جوش پر ٹھنڈے پانی کا چھڑکاؤ کردیا۔

"شاید، شاید کیا؟ ٹھیک بتاؤ، آخر؟"

"اب مجھے کیا معلوم- اماں جان حساب کتاب کرتی ہیں- ان ہی کو بلایئے (پکار کر) اے اماں جان' اماں جان- نمو کو نہلا رہی ہیں' آتی ہوں گی اور حساب کتاب کی کیا ضرورت ہے- دے دیجئے- روپے بچیں گے تو بھاگ تو نہ جائیں گے-"

"اونہہ- عجیب بے ڈھنگا پن ہے- ہم کہتے ہیں- سب کام قاعدے سے ہو- حساب ضرور لکھا جائے گا- آخر؟" حامد اماں جان کے دخل سے پھر بڑبڑانے لگا-

"اماں جان! آیئے نا-" رضیہ بولی-

" آئی بیٹی---- ذرا دم تو لے--- بچے کو نہلا لوں-" اماں جان دور سے چلائیں-

"تمہیں تو کچھ معلوم ہی نہیں- گویا گھر کے معاملہ میں کوئی دلچسپی ہی نہیں-"

اماں جان کے پیروں کی سڑپڑ سن کر وہ چپ ہوگیا- وہ بچے کو دوپٹے میں لپیٹے پانی ٹپکاتی آکر پلنگ پر بیٹھ گئیں-

"اے ہے---- ہاں اب بتاؤ---- کیا ہے؟ تھک گئی------ ایسی شرارت کرتا ہے نہانے میں کہ توبہ بھلی------ ہاں کہو" وہ اس کا سر پونچھتی ہوئی بولیں-

"جنس وغیرہ کے متعلق پوچھ رہے ہیں-" رضیہ بیگانوں کی طرح بولی-

"ہاں- ہاں' تو لکھو- چودہ بزاز کے- تیس بنئے کے- سات گوٹہ والے کے دینے ہیں اور تین روپے اس کے تمہارے لبے جاموں والے کپڑے کے دینے باقی ہیں- سارے پے جامے پھٹ گئے- جہیز کے پہن رہی تھی- میں نے کہا اب بنا ہی ڈال- دودھ اور مکھن والے کو تو خیر تم خود ہی دے دیتے ہو- نوگھی کے- ساڑھے سات----"

"یہ لیجئے--- اور کچھ' اور رضیہ' کپڑے وغیرہ کے لئے اور کچھ؟ وہ براہ راست رضیہ سے بولتا رہا- اور اسی کو روپیہ دیتا رہا- گو اس نے چھوئے بھی نہیں اور بڑی بی ہر بات کا جواب دیتی رہیں- حالانکہ حامد نے بہت چاہا کہ ان کی موجودگی ہی

کو نظر انداز کردے۔ مگر۔ خیر۔

"ہاں اور رضیہ کے دوپٹے بھی پھٹ گئے ہیں۔ جہیز کے سارے دوپٹے جھیرے جھیرے ہوئے جارہے ہیں۔ ایک تھان پکی ململ کا چھ روپئے کا آئے گا۔ منگا لو۔"

"کیوں صاحب اب جہیز نہ ہوا قارون کا خزانہ ہوگیا کہ ختم ہی ہونے میں نہیں آتا۔ اور یہ جو پندرہ پندرہ بیس بیس روپئے مہینے کا کپڑا چھ سال سے خود اس کی تنخواہ میں سے بن رہا ہے یہ کہاں جارہا ہے کہ بس جو چیز ہے جہیز کی۔ حامد کا بس چلتا تو وہ رتی بھر جہیز نہ لیتا۔ ساری عمر کے طعنوں سے تو نجات ملتی۔

"یہ لیجئے چھ روپئے" اس نے روپئے سامنے پٹخ دیئے۔

"اور وہ ----- بندے منو میاں کی دلہن پہنے تھیں۔ فریدہ کے بیاہ میں وہ تجھے بھی پسند آئے تھے۔ وہ منگوا لے رضیہ ----- کوئی کتنے کے ہوں گے" وہ رضیہ سے بولیں۔

"اب اندھیر ہے کہ نہیں۔ فرمائشیں بھی بجائے بیوی کے ساس صاحبہ کی معرفت آنے لگیں۔ اگر ایسا ہی تھا تو اے خدا بیوی دی ہی کیوں تھی۔ ساس ہی کافی تھی ----- وہ سوچتا رہ گیا۔

بڑی بی نے جو اسے چپ دیکھا تو بولیں "اے میں نے تو کہا تھا کہ اب کی سے جو میرا خرچہ آئے گا تو میں خود منگوا دوں گی۔ خواہ مخواہ کیوں منیر دولہا کو تنگ کروں۔ مگر وہ کئی مہینے سے کرایہ کا وہ کچھ گھپلا پڑ گیا ہے کہ بس کیا بتاؤں ----- ورنہ میں خود -----"

حامد نے موقع پاکر کہہ ہی دیا۔ "تو ہو آیئے نا چند مہینے کے لئے۔"

"کیسے جاؤں منیر دولہا، گھر سارا اوندھا ہو جائے گا۔"

"گھر بار کیا ہے؟ آخر رضیہ کو گھر بار چلانا ہی ہے۔ آپ ساری عمر تو نہیں ان کے پاس رہیں گی"

"مگر میرا جی تو اسے اکیلے چھوڑنے کو نہیں مانتا۔ اسی کے مارے اپنا گھر چھوڑے پڑی ہوں۔ الطاف بھیا ہاتھ جوڑتے ہیں کہ کچھ دنوں کو آجاؤ۔ منی آپا کہتی

ہیں کہ میرے یہاں رہو (غرور سے) مجھے تو سب ہاتھوں ہاتھ لینے کو تیار ہیں۔ کوئی یہ بات نہیں کہ مجھے اللہ نہ کرے، کھانے پینے کی کمی ہو۔"

حامد کو شک ہوا کہ کہیں اماں جان کو اس کے دل کا حال تو نہیں معلوم ہو گیا۔ جی ہاں وہ بڑی آزادی سے سوچا کرتا تھا کہ کاش الطاف بھیا کو ان پر ایسا پیار آئے کہ بس پکڑ ہی لے جائیں اور منی آپا کو ایسی محبت چرائے کہ بس انہیں کلیجے سے ایسے چمٹائیں کہ قیامت تک نہ چھوڑیں۔ پھر؟ وہ کس قدر فضول خیال----- ایں خیال است و محال است و جنوں!----- یہ کہیں ہو بھی سکتا ہے کہ وہ ہو اور رضیہ اور بس!

حامد کو خاموش دیکھ کر اماں جان پھر بولیں۔ "دوسرے نمو مجھ سے ایسا ہل گیا ہے کہ گھڑی بھر کو نہیں چھوڑتا۔"

"کچھ نہیں، اتنا بڑا ہو گیا ہے اسے بندر کی طرح چپکائے رہنے کی کوئی ضرورت نہیں چھوڑ جایئے۔ آپ اسے ٹھیک ہو جائے گا۔"

اس نے پھولے گالوں والے گستاخ انسان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا اور اس نے اپنا منا سا ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "ہٹ ہم مار دیں گے۔"

اس چار برس کے لوٹھے سے حامد کو دلی بغض تھا۔ وہ اپنے بچے سے سوتن کا سا بیر رکھتا تھا جب دیکھو گود میں لدا ہوا الّا بلا کھایا کرتا اور جو کبھی چمکار کر بھی حامد اس سے نیچے اتر کر کھیلنے کو کہتا تو وہ اپنا منا سا خوبصورت جوتا اٹھا کر اسے مارنے کی دھمکی دیتا۔ اس کی اس ادا پر اماں تو بس لوٹ جاتیں وہ اسے چٹاخ چٹاخ چومتیں اور کلیجہ سے لگا لیتیں اور رضیہ بھی مسکرائے بغیر نہ رہتی۔ مگر حامد جیسے انگاروں پر لوٹ جاتا۔ اس کا جی چاہتا تھا اس ندیدے بدتمیز انسان کو موٹے ڈنڈے سے اتنا مارے کہ یہ منوٹی موٹی بدھیاں پڑ جائیں اور سب اکڑنا بھول جائے مگر وہ لاچار تھا۔

تو پھر نمو کو بھی لے جایئے۔" رضیہ بولی۔

"ہاں مجھے بھی لے جایئے" وہ دانت بھینچ کر بولا۔

"کیا جائے۔ چائے لاؤں منیر دولہا؟" اماں جان نے کچھ نہ سن کر کہا۔

ایک تو ویسے ہی کیا کم حامد جل رہا تھا کہ اور بڑی بی نے "گرمیوں میں گرم چائے ٹھنڈک پہنچاتی ہے" کی مثال صادق کردی۔ حامد کا جی چاہا کہہ دے "ایک دفعہ ہی مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دو نا" لیکن چونکہ وہ بہت مہذب تھا لہٰذا خاموش رہا۔

اماں جان بچے کو جھوٹ موٹ دکھاوٹ کے لئے ہٹا کر بولیں۔ "اے ہٹنا میاں ذرا میں چائے بنا لاؤں۔"

"آں ---- نئیں۔" وہ منمنا کر بولا اور حامد نے منہ پھیر لیا۔ کہاں تک دکھ سہے جاتا۔ "نمو میاں ---- اماں جان چائے بنائیں گی میرے پاس آجاؤ۔" رضیہ چمکار کر بولی۔

"نا ---- آ ---- میں۔" بچہ اور اترایا۔

"اے بیٹے میں چائے بناؤں گی تو کیا تمہیں لادے رہوں گود میں، اپنی ماں کے پاس جاؤ۔"

"ہاں ----- ہنک ----- ہنک۔" نمو اٹھلایا۔ "تم ہو ہماری اماں۔"

"اے میرا لال۔ میرا کلیجہ۔ میرا چاند کا ٹکڑا۔ لو دیکھ لو منیر دولہا۔ تم کہتے ہو چھوڑ جاؤ بچیکو، بھلا خون کردے گا۔ رو رو کے جینا اجیرن کردے گا۔"

"کچھ نہیں ---- دو روز میں ٹھیک ہو جائے گا۔" حامد نے تخیل میں نمو کو ٹھونکتے ہوئے کہا۔

"واہ۔ میں اپنے لال کو کیوں چھوڑ کر چلی جاؤں۔ کیوں میاں جاؤں۔ ہٹو۔ بھئی میں جارہی ہوں۔ (بچہ رو کر چمٹ گیا) اے واہ میں تو جھوٹ موٹ کہہ رہی تھی (ہنستے ہوئے) چل میرے لال میں تجھے گود میں لے کر چائے بناؤں گی۔ چل ---" (بڑی بی بچے کو لاد کر کراہتی ہوئی چلی گئیں)

"ناس کردیا لڑکے کا" حامد نے پھنکار کر کہا۔

"ستیاناس کیا کردیا ---- جس محبت سے وہ پالتی ہیں کوئی کیا پالے گا۔" وہ اس قدر ضدی بچہ ہے کہ میرے تو بس کا نہیں اور بھئی وہ نہ ہوں تو کون اس کی

دیکھ بھال کرے۔ رو رو کے زندگی-----"

"کیا زندگی------ زندگی------ یہ بھی کوئی زندگی ہے کہ ہاتھ پر ہاتھ رکھے پڑی ہو۔" اماں جان منہ میں پانی ٹپکا دیں تو خیر ورنہ نہیں---- اماں جان روٹی دیں تو پیٹ بھرو ورنہ بھوکے ہی رہیں۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ توبہ۔ توبہ۔ یہی نہیں معلوم ہوتا اپنے گھر میں رہتے ہیں----- ایسا لگتا ہے جیسے سرائے میں پڑے ہیں۔ خیرات ملتی ہے۔ گویا اپنی کمائی نہیں کھاتے------ لاحول ولا قوۃ" وہ بڑبڑایا۔

"وہ تو میری وجہ سے یہاں پڑی ہیں۔ تمہیں ہی ہزاروں طرح کے آرام ہیں۔ ان کے دم سے----- وہ تو آج چلی جائیں۔ دوسرے وہ کسی کی محتاج تو ہی نہیں۔ اپنا کھاتی ہیں بلکہ چار پیسے اپنے پاس سے ہمارے اوپر لگا دیتی ہیں۔ سب ہی جانتے ہیں کہ سو سوا سو روپے میں اتنا اجلا خرچ نہیں ہو سکتا۔

تو کون کہتا ہے کہ یہاں۔ آن بیٹھ کر اپنا نقصان کریں (ہونہہ----- خوب کون روکتا ہے"۔

"یہ ان کی محبت ہے جو روکتی ہے ورنہ-----"

"ارے لعنت ہے ایسی محبت پر----- جو دوسروں کی زندگی اجیرن ہو جائے" (اماں جان کو آتے دیکھ کر سٹپٹا کر باہر جانے لگتا ہے)

"اے منیر دولہا۔ اے منیر دولہا! چائے نہیں پیو گے۔" وہ گھبرا کر بولیں۔

"جی نہیں۔" اور وہ پیر پٹختا روٹھے بچے کی طرح باہر چلا گیا۔

"رضیہ! یہ کیا معاملہ ہے" بڑی بی بولیں۔

"نہ جانے۔ نمو کی ذرا سی ضد پر غصہ ہو گئے" رضیہ رو کر بولی۔

"اوئی بچے کی ضد پر کیسا غصہ۔ نہیں جی یہ کوئی اور بات ہے۔ کئی دن سے دیکھ رہی ہوں مزاج ہی نہیں ملتا۔ ہر وقت اکڑے اکڑے رہتے ہیں۔ کچھ دال میں ضرور کالا ہے میں----- پہلے ہی----" رقت سے آواز رک گئی۔

"نہ جانے" رضیہ سسکیوں سے رونے لگی۔

"خدا غارت کرے اس ڈائن قطامہ کو جو میری بچی کا گھر بگاڑے۔ میرے اللہ! خدا کی مار اس بیاروں پیٹی پر جو میرے دولہا کا دل میری بچی کی طرف سے پھیرے یا اللہ۔ میرے۔۔۔"

وہ دیر تک جاء نماز پر بیٹھی "اس ڈائن" کو کوستی رہیں۔'

❀❀❀
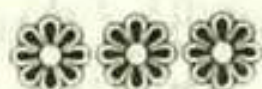
بچپن

ابھی چند روز ہی کا ذکر ہے کہ لائبریری صاف کرتے میں "عصمت" کے پرانے پرچے نظر پڑے۔ ایک عنوان دیکھ کر خیالات نہ معلوم کہاں سے کہاں دوڑ گئے یہ مضمون مس حجاب اسمٰعیل کا تھا اور عنوان "بچپن" تھا۔

مس حجاب اسمٰعیل (جب کہ وہ مس حجاب اسمٰعیل تھیں) اخباروں کی ہیروئن تھیں ایک رومینٹک سا نام جس میں کچھ جدت، کچھ نزاکت اور کچھ افسردہ حسن کی جھلک تھی اور پھر ان کے مضمون "اوہ معبود" لفظوں کی مسلسل قطاریں "دریچہ" "سمندری کوٹ" "کاہیدہ جسم" "موم بتی جیسی انگلیاں" "ڈاکٹر گار" "بوڑھی بھینس" "چوہیا زوناش" اور ایسی ہی ادنے عقل سے بالاتر باتیں کچھ عجیب سا بے وقوف بن جانے پر مجبور کرتی ہیں۔

آمدم برسر مطلب۔ تو یہ مضمون ان کے سریلے بچپن کے متعلق تھا۔ ہمیں ایک زیر لب مسکراہٹ کا مرہون احسان ہونا پڑا۔ بچپن! جسے دیکھو بچپن کے شیریں نغمے الاپ رہا ہے۔ "بے فکری کا زمانہ مسرت سے لبریز گھڑیاں" اور "کھیل کود کے دن" عموماً" بچپن سے وابستہ سمجھے جاتے ہیں۔ ہم خود جب سب کو بچپن کی مزے دار باتیں اور مختلف قسم کے لاڈ پیار کے قصے سناتے دیکھتے ہیں تو اصلیت کو ذرا "ویسا" کر کے سنا دیتے ہیں۔ "یوں کھیلا کرتے تھے" یوں اماں جان نے پیار کر کے کلیجے سے لگا لیا"۔ "یوں کھلونے تحفے میں آیا کرتے تھے"۔ آپ ہی بتایئے کیا کریں۔ کیا سب سے کہہ دیں کہ بھئی جان بچی لاکھوں پائے اچھا ہوا کہ وہ ناپائدار زمانہ گزر گیا۔ ہم تو یہ کہتے ہیں جو یہ ناپائدار نہ ہوتا تو ہم لوگوں کا جن کے نہ تو "چچا گار" نہ "کیپٹن ہارلی" اور نہ "کاہیدہ جسم" اور نہ کبھی قہوہ وغیرہ ملے۔ نہ چاکلیٹ کے بنڈل کھانے کو ملیں، کیسے گزر ہوتا۔ ہم تو جب تک چھوٹے رہے مداری کے

بندر جیسی حالت رہی صبح ہوئی اور آپا نے لوٹا اور منجن کا پڑا سنبھالا اور پوری فوج کا منہ دھلانا شروع کر دیا۔ اب لاکھ کہتے ہیں۔ ہنک ہنک بھئی کل ہی تو منہ دھویا تھا تو بعد ایک دھموکے کے جواب ملتا ہے پھر روٹی بھی آج مت ٹھوسنا۔ کل ہی تو کھائی تھی۔ اب دیکھئے جواب ان کی فلاسفی کا۔ یہ بھر بھر کے بکٹے منجن منہ میں بھر بھر کے رگڑے دے رہی ہیں۔ تو نشانہ تو باندھتی نہیں۔ کبھی انگلی پھسل کر ناک میں گھسی جاتی ہے تو کبھی گال کو دردرے منجن کے گھسے دیتی ٹھوڑی پر پہنچ جاتی ہے۔ گردن پر اس طرح پانچوں انگلیاں پیوستہ جیسے زیادہ کرایہ مانگنے والے تانگے والے کو دھکے دیئے جاتے ہیں۔ بہتیرا ٹھنک رہے ہیں۔ مگر کچھ سنائی نہیں دیتا۔ ذرا سوچئے اب ذرا کالے رہ جائیں گے تو کیا ہرج ہو جائے گا۔ نہیں ہم بر دکھوے کو جا رہے ہیں۔ جیسا کہ خود آپا مسلے ہوئے کپڑے پہناتے ہوئے فرماتی ہیں۔ روز صابن کے رگڑے، جو مزاحمت کرو تو حکم ملتا ہے "اگر روئی تو سچ مچ آنکھوں میں صابن گھسیٹر دوں گی"۔ گویا اب تک صرف جھوٹ موٹ گھسیٹر رہی تھیں۔

اب منہ دھلنے کے بعد تولیہ کے داؤں دکھانے شروع کئے۔ گویا کوئی چپٹی سینی ہے۔ جو دلکائی جا رہی ہے۔ خواہ ناک تولیہ ہی میں لپٹی چلی جائے مگر روؤ مت، سارے مراحل طے ہونے کے بعد جو کہا "کھانا" تو کہا جاتا ہے "اوئی توبہ ایسی بھی کیا بلبلاہت ہے۔ صبح ہوئی اور روٹی کا پیٹنا پڑ گیا۔ ابھی چیل کوؤں نے کوڑا بھی نہ کریدا ہو گا۔ ایسا ہی ہے تو پیٹ سے روٹی باندھ کر سویا کرو" کہو بھلا پھر منہ کیوں دھلا۔ چیل کوؤں کا کب دھلتا ہے۔ منہ انسان دھوتا ہے۔ کھانے کیلئے۔ ایک دن جو ہماری شوکت آپا بیچاری نے روز روز کی منجن بازی سے تنگ آکر کہیں کہہ دیا کہ "بھئی ہم آج منہ نہیں دھوئیں گے۔ کیونکہ ہم کھانا نہیں کھائیں گے" تو آج تک ان کی چنچل ہوتی ہے۔

اب ناشتہ کا دور شروع ہوا۔ آپا بیچاری کا تو یہ کہ انہوں نے تو رات کے کوفتے گرم کر لئے اور باسی روٹی میں گھی اور پانی کا چھینٹا دے کر باسی کوسی کھالی اور ہم چائے پئیں۔ آپا کو چائے خشکی کرتی ہے اب اگر چائے میں شکر نہیں ڈالی تو پھر لیجئے

ایک کھائی پھاندیئے۔ جو مانگی تو کہا گیا۔ "توبہ ہے! دو ہاتھ ہیں، ان سے کیا کیا کروں۔ بچی ذرا چھری تلے دم تو لے۔ شکر پر مری جاتی ہے۔ چیونٹی کہیں کی۔ لو، جو تھوڑی دیر منمنانے کے بعد ویسے ہی پی لی تو اور آفت "اللہ رے ندیدن! ذرا صبر نہ ہوا۔ وہ پھیکی ہی غٹ غٹا گئی۔ لڑکی ذات ہو کر ایسی ندیدی، کیا پھیکی بھی نہ لگی"۔

یہ عورت ذات ہو کر تو میری بڑی مٹی خراب ہوئی۔

ابھی ناشتہ سے فارغ ہو کر دو ہی تین چکر لگائے ہوں گے کہ "ماسٹر صاحب آ گئے" کی صدا آ گئی۔ خون میں ایک قسم کی کمزوری سی غالب آ گئی۔ رگ اور پٹھوں میں دم نہ رہا۔ جی چاہا مچل جائیں۔ نہ معلوم اب کیا کریں۔ اب کتابیں ڈھونڈتے ہیں تو وہ نہیں ملتیں۔ کمبخت دوات کرسی پر رکھی رکھی آپ ہی الٹ گئی۔ تختی دھونا یاد ہی نہ رہا۔ قلم پر باجی مع اپنے تندرست جسم کے کھڑی ہو گئیں۔ گھر کے اس کونے سے اس کونے تک "ارے بھئی۔ ہائے اللہ!" کرتے چکر کاٹ رہے ہیں۔ خیر خدا خدا کر کے کل مرحلے طے ہوئے اور چبوترے پر مسئلہ تعلیم نسواں حل ہونے لگا۔

کمبخت ایک کتاب آفت ہو کر چمٹ گئی۔ ابا میاں کے روز روز کے تبادلوں نے ایک مستقل مدرس تو ہم لوگوں کا رکھا نہیں۔ نئی جگہ پھر سے وہی محمد اسمٰعیل صاحب کا قاعدہ یا پہلی دوسری کتاب شروع کر دی۔ کتاب کا رنگ و روپ --- اور قد و قامت کچھ ایسا ہو گیا کہ ہم ٹٹول کر بتا سکتے تھے کہ یہ ہماری کتاب ہے مگر اس میں جو بیش بہا مضامین تھے ان سے ہم کورے ہی رہے۔ نہ معلوم کیسا طریقہ تعلیم تھا کہ مہینوں کھمنوں پر ہاتھ پھیرتے مگر کسی طرح کچھ نور علم ہم پر نزول نہ فرماتا۔

اب دل خانہ خراب ہے کہ نہ معلوم کہاں بہتا چلا جاتا ہے اپنی حالت کو دیکھئے اور دنیا پر نظر ڈالئے۔ حسینا بھی برتن مانجھ کر کبڈی کھیل رہا ہے اس کی "بڈبڈ" پر بے اختیار آنکھ اٹھ جاتی۔ منگیا بھی گوبر تھاپ کر مزے سے ہمارے سامنے ہی جامنیں جھاڑ جھاڑ کر کھا رہی ہے۔ یہاں تک کہ ڈھالو اور بلکایا وجود پلے ہونے کے

آزادی سے دوڑتے اور ہم "پل پر جا" "وہ اس کا دیور ہے" "گنگا جمنا سے بڑی ہے" بکا کرتے۔ وائے بر حال ما۔

جب ماسٹر صاحب مطمئن ہو جاتے کہ ہم لوگ باقاعدہ ٹھک ٹھکا چکے اور میرے بازوؤں اور رانوں پر خوب گہرے گہرے نیل پڑ چکے (عورت ذات ہونے کی وجہ سے ماسٹر صاحب مجھ پر ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے بلکہ نہایت میٹھی میٹھی چٹکیاں لیتے تھے بلکہ حکم تھا کہ "اگر اندر بتایا تو مار ڈالیں گے" جب نہلاتے میں آپا دیکھتیں تو ان میں ایک نیل کا اور اضافہ کر دیتیں کہ (کیوں ایسی جگہ جاتی ہے جو گر کر نیل ڈالتی ہے) اب املا کی باری آتی۔ یہ بدبخت سیاہ روشنائی نہ معلوم کن سائنٹفک طریقوں سے تیار کی جاتی ہے کہ ہمارے قابو میں تو کبھی اس کا قوام آیا نہیں۔ کبھی تو ایسی کہ شوبہ لو تو لوتھڑے جھولتے چلے آتے ہیں اور کبھی یہ کہ دھڑ دھڑ کے قلم ٹھونک رہے ہیں اور سیاہی پھیکی پھدک۔

خدا خدا کر کے چھٹی ملی۔ بستہ بغل میں' بدبو دار سیاہی میں لتھڑی ہوئی انگلیاں تختیاں گھسیٹتے' منہ بسورتے چلے آ رہے ہیں۔ جو کسی نے کہہ دیا پٹیں' مت رو' بچاری!" بس وہیں پسر گئے۔ اب جو کہتے ہیں "بیوی کھانا" تو جواب ملتا ہے "مجھے کھا لو۔ اے ہاں نہیں تو" کھانے پر ہر چیز ثقیل۔ بہت گرم' بہت ٹھنڈی اور دیر ہضم ہو جاتی ہے۔ بوٹی مانگو تو جواب ملتا ہے "میری بوٹیاں نوچ لو" جو کہا "ہمیں بھی انڈا دو۔ چنو کو جو دیا" تو جواب ملتا ہے "اب کھانچی لاؤ تو انڈے بھی دوں اور کیا میرے باوا نے دھڑوڑ رکھوا دی ہے" آپا بیچاری کو بس چند گودے کی ہڈیاں ایک آدھ سینے کی یا کری ہڈی مل گئی وہ انہوں نے کھا لی۔ سالن نہ بچنے کی وجہ سے دو تین انڈے تلوا لئے۔ بانٹنے والے کی یہی تو خرابی ہے کہ الٹا سیدھا ملتا ہے دوپہر کو چن چن کر سب کی ایک قطار بنا دی۔ خس کی ٹٹی لگی ہے۔ پنکھا چل رہا ہے ہم پر دفعہ ۴۴ قائم ہے۔

ہلو مت۔

کروٹیں مت لو۔

فرش پر لوٹیں مت لگاؤ۔
خربوزے تربوز جو ٹٹی کے پاس رکھے ہیں انہیں گنو مت، نہ ہی چھوؤ۔
پنکھے کی جھالر میں جھولو مت۔
گھس کر مت لیٹو۔
یہ مت کرو۔
وہ مت کرو۔
اب ذرا ان "متوں" پر غور کیجئے۔
ٹٹی کے کمرے سے چھوٹتے ہی چنو اور شمیم تو کھیلنے چلے جاتے لیکن عورت ذات گڑیاں کھیلتی۔ قول ہے کہ ڈھنگ سے بیٹھ کر گڑیاں کھیلو، سلیقہ آتا ہے۔
کیا بتاؤں مجھے ان کمینی گڑیوں سے کیسی للّہی ہے۔ ان گڑیوں سے کوئی کیا کھیلے۔ بیچوں کی شکل، کپڑوں کے ڈھیر تھے کہیں انگریزوں والی بات تھوڑی تھی کہ چاہے نہلاؤ دھلاؤ کچھ نہیں بگڑتا۔ یہاں تو یہ حال کہ دو دن میں چوہا۔
گڑیوں میں عام طور پر بیاہ کا کھیل کھیلا جاتا ہے۔ ہماری بہت سی گڑیاں تھیں لیکن ایک چکٹ سا گڈا۔ وہی "فردا" ہر گڑیا کا خدائے مجازی بنتا۔ اگر کہو بھی گڈے اور بنوا دیئے جائیں تو نہ معلوم کس سائیکولوجیکل نقطہ نظر سے جواب ملتا نہیں بس گڑیوں سے کھیلو۔ گڈے کی کوئی ضرورت نہیں"۔
ابھی رسم کتخدائی ختم بھی نہ ہونے پائی کہ مولوی صاحب آگا..... ئے۔ کل حواس کھوئے جاتے۔ جی چاہتا سو جائیں مگر کہاں۔ دو تین جھنجوڑیاں دے کر کھڑے کردیئے جاتے۔ چلئے قاعدہ سنبھال کر۔ راستہ میں ذرا پانی پینے رکے تو چند بند ہیں۔ "اب چلو کیا پے جاؤ گی" کہو بھئی تجھے کیا۔ تو تو جا۔ مگر وہ ہے کہ ڈٹا کھڑا ہے آپ خواہ نو گلاس پی جائیے۔ مگر وہ ساتھ لے جاکر چھوڑے گا۔
جھوم جھوم کر سبق شروع ہوا۔ آنکھ اونگھ ا۔لنکھ۔ تانکھ تونکھ تینکھ۔ چلا چل پھر وہی اختلاج شروع ہوا۔ قاعدہ کا صفحہ زیادہ غیر دلچسپ ہونا شروع ہوا۔ پیلے پیلے کاغذ پر سیاہ بدوضع حروف منہ چڑانے لگے۔ ادھر ادھر دیکھنے کو جی چاہا۔ ہر چیز ہماری

توجہ کی محتاج نظر آنے لگی- چنو کی گیند جو کسمپرسی کی حالت میں موری کے پاس لڑک رہی تھی- آپا کا الگنی پر پڑا ہوا دوپٹہ درخت کے پتے- مولوی صاحب کی ٹوپی کا پھندنا- شمیم کا امنڈا ہوا سرخ کان سبق سے زیادہ دلچسپ اور حسین معلوم دینے لگے-

گھر میں آپا کی وہی حیثیت تھی جو آج کل ہٹلر اور مسولینی کی ہے- احکامات اعلیٰ وقتاً" فوقتاً" ہماری اصلاح کیلئے محکمہ جات تدریس میں صادر ہوتے رہا کرتے تھے- ایک سپارہ ختم کرتے ہی محسنہ کو "عورت ذات" کی فلاح و بہبود کی فکر ہوئی اور کہا بھیجا کہ قرات سکھائی جائے تاکہ دین دنیا دونوں روشن ہو جائیں کھل گئی ہوتی جنت کی کھڑکی- مگر اس گنہگار سے قرآت قابو میں نہ آنا تھی نہ آئی- یا تو یکمشت چھ چھ تانیں نکل پڑتیں' یا گلے میں صرف ایک عدد پھندا پڑ کر ابکائی آ جاتی- جو چٹکی کے ایک شیریں ہچکولے سے مجروح ہو کر نیم جان قاف پر دم توڑ دیتی- اتنی دیر میں مسائل تصوف حل کرتی- چنو ٹکھنوں پر ہاتھ پھیرتا جاتا اور میری حالت زار پر مسکراتا جاتا- شمیم خود ایک ناقدانہ مسکراہٹ کے ساتھ غور سے میری ہر حرکت کو نوٹ کرتا جاتا- تاکہ بعد کو میری نقلیں سب کے سامنے کر کے مجھے خون کے آنسو رلائے- اسی اثناء میں اگر برات یا اسی قسم کی کوئی وجدانی کیفیات پیدا کر دینے والی چیز آ جاتی اور ہم چونک کر "مولی صاحب برات" کہتے تو بس تھپڑوں کے زناٹے' چپتوں کے چٹاخے اور چٹکیوں کی سسکیاں شروع ہو جاتیں- بظاہر مولوی صاحب صرف میرا بازو پکڑ کر ہلا دیتے- لیکن نہایت ہوشیاری سے انگوٹھے اور کلمہ کی انگلی ملا کر چکا چوند کرنے والی چٹکی لے لیتے' جو آستین ہی میں جذب ہو کر رہ جاتی-

ہم "کافروں" سے وہ بارہا کہہ چکے تھے کہ باجہ کی آواز پر لاحول بھیجا کریں اور اس کا قد ہلکا نہ کریں- کیونکہ قیامت کے روز دجال باجہ بجاتا آنے والا ہے اور باجے کے شوقین لوگ اس کی آواز پر دوڑیں گے اور دوزخ میں جائیں گے-

ہم لوگ چپ ہو کر توشہ عقبیٰ سمیٹنے میں لگ جاتے-

وہاں سے چھوٹ کر آتے۔ آپا کچھ تل رہی ہوتیں۔ کیا مجال جو مجھے یا چنو کو ایک مکھی برابر آٹا دے دیں۔ کچھ بھی کڑھائی میں ڈال لینے دیں۔ چنو تو خیر گھی کا لڈو ٹیڑھا بھی بھلا ہے۔ "عورت ذات" تو پانچوں انگلیاں پانچوں چراغ ہونا چاہئے۔ ورنہ نہ معلوم کس کے گھر جا کر آگ لگاؤں۔ مگر اس وقت میرے سگھڑاپے کا سوال بالائے طاق رکھ دیا جاتا ہے۔ وہ تو جس وقت کھیلنے میں میرا داؤ آئے گا فوراً میرا سگھڑاپے کا خیال بھی آئے گا اور کمر بند سینے یا اور کوئی ردی سی بد شگنی شے میں بھیجا مارنے کا حکم نہ ملے گا اس وقت تو حکم ملتا ہے بس چلو یہاں سے، کفگیر دوں گی جو اب کے آئے۔ کڑکڑاتا تیل ہاتھ پر رکھ دوں گی جو تو نے لگنی کو ہاتھ بھی لگایا۔ اب کے آٹا مانگا تو جلتا جلتا انگارہ ہتھیلی پر رکھ دوں گی۔ "دیکھو بھئی اماں یہ نہیں مانتی" وہاں سے حکم ملتا ہے "مارو" لیجئے!

اب کھیلنے کہاں جائیں "پلنگوں پر مت کھیلو، جھولا ہو جائیں گے" "تختوں پر مت کودو، دھڑ دھڑ سے کان اڑے جاتے ہیں" چبوترے پر تل دھرنے کو جگہ نہیں۔ انگنائی میں میری شوقین آپا کی کیاریاں مت کھوندو ورنہ ٹانگیں توڑ دیں گی۔ کبھی سل سے ٹھوکر لگتی ہے تو کبھی لوٹا اوندھا ہو جاتا ہے کبھی سینی میں پیر پڑتا ہے تو کبھی بچے کے پالنے میں الجھے جاتے ہیں۔ کچھ نہیں تو کونے میں کھڑا ہوا بانس ہی ذرا سے بہانے سے دھڑام سے سر پر آن پڑا۔ ساتھ ساتھ صابن دانی موری میں لڑک گئی اور جا کر سوئے ہوئے کتے پر گرے۔ کیا آفت ہے۔ الٰہی یا تو ان بچوں کو اٹھا لے یا میری مٹی عزیز کر دے ایسے بچے بھی کہیں دنیا جہان میں ہوا کرتے ہیں۔ ہوں تو کوئی کا ہے کو جیے۔ مختلف وزن اور لے کی ڈانٹوں کے بعد بٹھا دیئے جاتے کہ خبردار جو ذرا بھی ہلے، ہڈیاں توڑ دوں گی۔

رات کو بستروں کے سپرد کر دیئے گئے کہ "لو مرو" خیر مرنے سے پہلے ہنسی ہے کہ قابو ہی میں نہیں آتی۔ چلے آتے ہیں کھوں کھوں۔ کھی کھی۔ کھک کک کھوں۔ حکم ملا کہ اب کے اگر سانس بھی لی تو گلا گھونٹ دیا جائے گا۔ اب سوئے تو خاک خواب شیریں کی توقع رکھ سکتے ہیں۔ سوائے اس کے کہ پڑے بھاگ رہے ہیں

کتے۔ بندر الو' بیل پیچھے دوڑے چلے۔ پانی ہی پانی جس میں مٹکے برابر مینڈک چوہیاں ہی چوہیاں گاڑی چڑھی چلی آتی ہے۔ اکنیاں ہی اکنیاں پڑی ہیں۔ خوشی خوشی جمع کر لیں۔ کس کے مٹھیوں میں پکڑ لیں۔ آنکھ جو کھلی تو مٹھیاں تو ویسی ہی گنھی ہوئی ہیں اور اکنیاں غائب۔ جو روئیں تو آواز آتی۔ "اے ہے رات کو بھی چین نہیں۔ چپ۔ نہیں تو دے دوں گی کتے کو اٹھا کر "صبح کو پھر وہی منجن اور وہی ہم۔

اب' اور اب.... معاذ اللہ۔ گویا سوراج ملا ہوا ہے۔ اپنی راجدھانی ہے۔بستر میں لیٹے لیٹے چائے پی۔ اٹھ کر ناشتہ کیا۔ بج سجا کر دفتر گئے۔ کھانا وقت سے ذرا دیر میں ملا اور نوکر پٹا۔ بوٹی خوب اور گلی ہوئی ملتی ہے انڈے کھاتے ہیں جب تک چاہو غل مچاؤ اور ہنسو۔ بالکل شور نہیں ہوتا۔ پلنگوں پر چاہے جتنا کودو جھولا نہیں ہوتے اور جو ہوتے ہیں تو حامد پٹتا ہے۔ تخت پر کتنا ہی کودو کسی کے کان نہیں اڑتے۔ چاہے سارے آٹے کو لے کر کڑھائی میں ڈال دیں کوئی کفگیر نہیں مارتا۔ آپا منجن ضرور تیار کرواتی ہیں اور گھسے بھی لگتے ہیں مگر مکھن اور مینو کے۔ ہمیں تو نرم برش اور خوشبو دار کریم کافی ہے۔ کسی قسم کے ماسٹروں کے آنے کا قطعی حکم نہیں۔ صرف میوزک ماسٹر آسکتا ہے وہ بھی بعض وقت محض سستی کی بنا پر بھگا دیا جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ ہم اب بچہ تھوڑی ہیں جب کہ کوئی فکر نہ تھی۔ آزاد زندگی بھولپن کا زمانہ پیاری پیاری باتیں۔ سکھ کی نیند۔ کاش بچپن پھر ایک دفعہ... خیر۔

❁❁❁

تاریکی

چاند کی آخری تاریخوں میں جب چاند غائب ہو جاتا ہے اور چمگادڑیں غوطے لگاتی ہوئی سیاہ فضا میں غوطے لگاتی ہیں مجھ پر ایک جنونی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

"آموں والے باغ کے پیچھے!"

اس دن میرے کانوں میں کوئی گنگنا رہا تھا۔۔۔۔ لیکن پھر وہی کہیں یہ بھی اسی کی طرح نہ چڑ کہ؟ ۔۔۔۔ خیر۔

میں نے یوسف سے کہا "یار میری آواز بنا کر حاضری بول دینا اور سیدھا اسٹیشن کی طرف اڑا۔ ابھی گیارہ بجنے میں ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا۔ میرے ہاتھ نہ جانے کیوں کانپ رہے تھے۔ میں نے چڑ کر دو بیگ اور پی لئے اور دیر تک ویٹنگ روم کے سامنے ٹہلتا رہا۔

"ٹھنا۔۔۔۔ ٹھن" گیارہ کا گھنٹہ ایک گھن کی طرح میرے کلیجہ پر پڑا۔ دو دفعہ پیر پیڈل پر سے پھسل کر واپس سیڑھی سے ٹکرایا۔ تیسری کوشش میں دوسری طرف گرتے گرتے بچا۔ آج سائیکل بھی زور دکھا رہی تھی۔ جیسے اسے میری کمزوری کا پتہ چل گیا ہو۔ ہوا ایک بھری ہوئی ناگن کی طرح میری سائیکل کے پہیوں سے زور آزمائی کر رہی تھی۔ آگے کا پہیہ مست شرابی کی طرح جھوم رہا تھا۔ میں سائیکل سے چمٹ جانا چاہتا تھا۔ ڈگی والی سڑک سے ہوتا ہوا داہنے ہاتھ والی کچی سڑک پر مڑ گیا۔ دھول اور گڈھے، شام کو گزرنے والے مویشیوں کی غلاظت، ان سے بچتا ہوا دودھ پور کی سڑک پر نکل گیا۔ "آئے گئے بابو جی!" اس نے پلیا سے نیچے رینگ کر کہا۔ "اوں۔ کب سے ٹھاڑہن" وہ روٹھنے کے انداز سے بولی۔

میں نے سائیکل کو پیڑ سے لگا کر ڈال دیا اور ایک راجے کی طرح پلیا پر بیٹھ گیا وہ میرے گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھ کر میری آنکھیں ڈھونڈنے لگی رات اندھیری تھی۔ ارے تجھے ٹھنڈ نہیں لگتی۔

میں نے اندھیرے ہی میں اسے ٹٹولا- وہ گرم پانی کی بوتل کی طرح گرم اور پسیجی ہوئی تھی اس نے صرف ایک گہری سانس لی اور ہنس دی-

"انہوں!" میں نے پسینے' باسی کھانے اور خاک دھول میں بسے جھبکے سے بولا کر کہا- "چڑیل!"

"کا کریں-" ہی ہی ہی- وہ پھر ہنسی اور اپنے سر کو کھجانے کی کوشش کرنے لگی- بالوں کا جال- سڑے ہوئے تیل' خاک اور میل میں گندھے ہوئے سر پر ایک ٹوپی کی طرح منڈھا ہوا تھا مگر پلیا کے نیچے سڑنے والے پتوں کی مہک آم کے تازہ تازہ بور کی خوشبو- خود اس کے جسم کی بساند مل جل کر مجھے بدحواس کرنے لگی اس کا بات بات پر کھلکھلانا- کانسی کے کڑوں کی جھنکار- میں سب کچھ بھول گیا----

دور فضا میں چمگادڑ نے قہقہہ مارا- میری پیٹھ پر کنکھجورے سے رینگنے لگے- ہوا دق کے مریض کی طرح لمبی لمبی سانسیں کھینچ رہی تھی- رات کی کالونچ اور گہری ہو گئی-

----

جب میں لوٹا تو صفیہ کے کمرے میں ابھی تک لالٹین جل رہی تھی- میں آہستہ آہستہ زینے پر چڑھنے لگا- لیکن شاید وہ جاگ گئی- کیونکہ روشنی غائب ہو گئی- میرا سر جھک گیا-

"صفو!" میں نے صبح اسے پیار سے کہا-

"ہاں بھیا" وہ دوپٹہ اوڑھتی ہوئی کمرے سے نکلی- اس کی آنکھوں سے رات کو جاگنے کے آثار صاف ظاہر تھے' ہلکی سی زردی کی جھلک اور آنکھیں جھکی ہوئی- میرا جی چاہا کہ دوڑ کر اس کے پیر پکڑ لوں- میری ننھی سی بہن جو بیک وقت میرے لئے ماں' بہن اور خادمہ کی خدمت انجام دیتی تھی' اف- کس قدر پاجی ہوں میں بھی------ میں سر جھکائے چائے پیتا رہا اور وہ میرا سویٹر بنتی رہی-

----

میں نے زینے پر چڑھنے میں ایک دھاری دار قمیض سے ڈھکا ہوا کندھا دیوار

کے بالکل قریب دیکھا۔ جو فوراً غائب ہو گیا۔ "ہیں!" میں اچھل پڑا۔ "یہ کمینہ جھانکا کرتا ہے" میرا خون کھولنے لگا۔ میں نے صفیہ سے کچھ نہ کہا۔ وہ باورچی خانہ میں انگیٹھی پر جھکی ہوئی کچھ تل رہی تھی۔ میں پلنگ پر بیٹھ کر بوٹ کے تسمے کھولنے لگا۔

نہ جانے کیوں، میں جس وقت بھی گھر میں گھستا میری آنکھیں بے اختیار اس دیوار کی طرف اٹھ جاتیں جو ہمارے پڑوسیوں اور ہمارے درمیان کھنچی ہوئی تھی اور جس نے ایک گھر کو دو برابر حصوں میں تقسیم کر کے دو خاندانوں کے رہنے کا انتظام کر دیا تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا جیسے کوئی ادھر سے جھانک کر ہمیں دیکھا کرتا ہے۔ میرا شبہ یقین کو پہنچ گیا۔ جب کہ میں نے دھاری دار قمیض والا کندھا دیکھنے کے بعد ایک روز موٹی موٹی بھووں والی پیشانی کا کچھ حصہ اور پٹھے دار مردانہ بالوں کی جھلک دیکھی اور پھر ایک روز چار مضبوط بھوری انگلیاں دیوار پر تھوڑی دیر جمی رہنے کے بعد غائب ہو گئیں---- کوئی تیزی سے دیوار کے پاس سے ہٹا---- میرا سر گھومنے لگا اور فوراً میری نگاہیں صفیہ پر گئیں۔ وہ بالکل بے خبر دھوپ میں پھیلی ہوئی ساڑھی کو الگنی پر سے گھسیٹ کر اتار رہی تھی۔ شکر ہے کہ اس نے بدمعاش کو جھانکتے نہ دیکھا۔ ورنہ اس کے دل کو سخت رنج پہنچتا۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ آج ان لوگوں کو ٹھیک کروں گا۔ لفنگے کہیں کے۔
بدمعاش!

ارے یہ بتانا تو بھول ہی گیا کہ آموں والے باغ میں بور جھڑا آم لگے اور پک گئے---- امتحان ایک طوفان کی طرح ٹوٹ پڑے۔ کہاں کا آموں کا باغ اور کہاں کی اندھیری راتیں۔ جدھر دیکھو دو چار سر کتابوں پر جھونکے لے رہے ہیں۔ پھٹی ہوئی بے رونق آنکھیں۔ کچلی ہوئی جمائیاں۔ دبی ہوئی انگڑائیاں گاڑھی چائے کی بھی بس کی نہ تھیں۔ طالب علم کی زندگی میں سال میں دو ہی تو کٹھن وقت

ہوتے ہیں----- ایک امتحان سے کچھ پہلے- شب بیداری اور دوسرا نتیجے کے وقت---- خدا کی پناہ! سب سنسار کو بھول کر میں بھی اسی طوفان میں بہ گیا-

----

نیا سیشن' نئی صورتیں اور نئی دلچسپیاں لے کر آیا اور پھر وہی ہم---- وہی پروفیسروں کی غیر دلچسپ آواز- وہی جیسا چودہ برس سے ہم دیکھتے آئے تھے- وہی سامنے کالا کالا بورڈ- میز کرسی اور پروفیسر-

جب میرس روڈ کے چکر لگاتے لگاتے ٹانگیں شل ہو گئیں- گرلز کالج کی ہر ہوا خوری کی دل دادہ استانی کو ہر ممکن زاویہ سے دیکھ کر ان پر ہر قسم اور لے کے شعر پڑھ چکے تو اسٹیشن ہی سکون اور دلچسپی کی جگہ رہ گئی- لہٰذا حسب معمول وہاں کا رخ کرنا پڑا- وہاں سے کم پی کر زیادہ ظاہر کرتے ہوئے جیسے ہی میں اور یوسف سیڑھیوں کے قریب پہنچے' پیچھے سے کسی نے کہا"بابو جی!"

اور یقین مانئے وہ مع اپنی کل بساند اور بدبو کے موجود تھی-

"مای" اس نے گودڑ کی ایک پوٹلی کو کریدتے ہوئے اشارہ کیا- جیسے کسی نے مجھے پیچھے گھسیٹ لیا- "چر---- ریں" ایک بہت حقیر انسانی کیڑے نے کلبلا کر سوکھی ہوئی مٹھیاں ہوا میں اچھالیں---- وہ فاتحانہ مسکراہٹ سے کبھی اس کینچوے کو اور کبھی مجھے دیکھتی رہی-

"اہیں---- یہ ٹھاٹ ہیں----!" یوسف نے قہقہہ لگایا-

"بابو جی!" اس نے مجھے پھر پکارا---- مگر ہم پیڈل مار کر نکلے چلے گئے میں نے مڑ کر دیکھا تو---- وہ ایک تانگہ کے پیچھے چیختی چلاتی بھیک کے لئے دوڑ رہی تھی- گودڑ کی پوٹلی میں سے دو ٹانگیں---- سرخ سوکھی ہوئی ٹانگیں لٹک رہی تھیں- موڑ میں موٹر سے ٹکراتے ٹکراتے بچا- آگے سڑک سنسان اور تاریک تھی-

جب میں پلنگ پر لیٹا تو ایسا معلوم ہوا کہ کمرے کی ہر چیز گھوم رہی ہے
اوہ---- وہ دو سرخ خونی ٹانگیں میرے سامنے بے کسی سے جھول رہی تھیں۔
صرف دو ٹانگیں۔ دہکتے ہوئے لوہے کی دو سلاخوں کی طرح میری آنکھوں میں گھسی
جا رہی تھیں۔ میں نے بچنے کی کوشش نہ کی۔ گھسی جاؤ کمبختو میرے دماغ میں ---
اف کتنا اندھیرا تھا کمرے میں!

صبح ایک عجیب ذہنی دکھن نے مجھے پست کر دیا تھا۔ میں اپنی کمزوری پر جھنجلا اٹھا---

"اونہہ! آخر میں ہی کیوں اس قدر حساس ہوں۔ ہونے دو---- کیا ہوا پھر؟---- یہ سب کمزوری ہے۔ کمزوری۔ یعنی اس میں ایسی بات ہی کیا ہے؟ کون سا غضب ہو گیا؟ اور کیا ایک میں ہی ہوں؟"---- مگر میرا جی چاہا---- کوئی اس چبھن کو جو ایک سیسے کی گولی کی طرح میرے دماغ میں کانوں کے ذرا پیچھے اڑی ہوئی تھی، نکال دے۔ مجھے پھر غصہ آیا---- اپنی کمزوری پر---- میں کالج سے جلد ہی لوٹ آیا۔ صفیہ اداس اور خاموش بیٹھی تھی مجھے دیکھ کر جیسے ڈر کر چونک پڑی۔ میں بڑی دیر تک اس سے پیار کی باتیں کرتا رہا۔

"تمہارا نام لکھوا دوں گا اسکول میں" میں نے کہا۔

"وہاں میری کلاس میں چھوٹی چھوٹی لڑکیاں ہوں گی مجھے شرم آئے گی۔" وہ پریشان ہو کر بولی۔ گو ہمیشہ سے وہ پڑھائی کی شوقین تھی۔

"تو کیا ہوا!" میں ہنسنے لگا۔

"وہ چھیڑیں گی" اس نے گھبرا کر کہا نہ جانے اس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد کیوں تھا۔ کمزور اور نحیف۔ میرا جی چاہتا تھا کہ کسی طرح تو اسے بہلاؤں وہ کس قدر اداس اور خوف زدہ تھی۔ میں نے دیوار کی طرف دیکھا۔ شکر ہے کہ وہاں سے اب کوئی نہیں جھانکتا۔ مکان دو مہینے سے خالی ہو چکا تھا۔ میں اطمینان سے کالج چلا گیا۔

زینے پر چڑھتے ہوئے مجھے کسی کی گھٹی ہوئی آہ سنائی دی۔ میں خاموش کھڑا

ہو گیا- پھر وہی آہ- جیسے کوئی چیز میرے پیروں کے نیچے دبی تھی اور میرے چلنے سے کچلی جاتی تھی- ایک اور آہ اور میں تیزی سے اوپر پہنچ گیا ---- تھوڑی دیر برآمدے میں کھڑا رہا- "آہ" صفیہ کے کمرے میں ہے! میں جلدی سے چلا---- "صفیہ---- صفو!" میں نے پکارا- وہ پلنگ پر لیٹی کیا آڑی پڑی تھی---- مجھے آتا دیکھ کر اس نے جلدی سے رضائی اوڑھ لی اور گٹھری بن کر پڑ رہی تکلیف اس کے چہرے سے ٹپک رہی تھی---- دکھ سے اس کی آنکھیں پھٹ گئی تھیں- اور اس نے اس طرح اس طرح مجھے ڈر کر دیکھا گویا کوئی جن یا دیو ہوں میں کہ اسے کھا جاؤں گا- میں اس کے پلنگ پر بیٹھ گیا-

"کیا ہوا صفیہ! کہاں ہے درد؟ کیا بخار ہے؟میں نے اس کی پیشانی پر سے بال سمیٹے- وہ تکلیف کی وجہ سے کچھ نہ بول سکی- مگر اس نے گہری گہری سانسیں لینا شروع کیں اور بل کھا کر تکلیف کو چھپاتی رہی-

"اونہہ- یہ رضائی کو اتارو- کس قدر گرمی ہو رہی ہے---- افوہ!----"

اور وہ رضائی کو زور سے پکڑ کر اوندھی ہو گئی- اس نے گھٹی ہوئی آہ کو اور دبایا---- میں بری طرح گھبرا گیا---- یا اللہ! وہ ذبح کی ہوئی مرغی کی طرح اکڑ اکڑ تڑپ رہی تھی-

میں نے جلدی سے سائیکل اٹھائی اور کالج کی طرف اڑا---- ڈاکٹر ڈیوٹی پر تھے- نفیس کہیں باہر گئے ہوئے تھے---- اوہ میرے پیر کانپنے لگے----- صفیہ کی معصوم شکل آنکھوں میں پھرنے لگی---- میں نے دیکھا بھی نہیں- کتنے دن سے وہ ست اور بیمار نظر آتی تھی- حد ہوتی ہے لاپروائی کی بھی- میں ملامتیں کرتا زنانے سے چلا---- رمیش بھی موجود نہ تھے- مس نیوز لیڈی ڈاکٹر- میں تیزی سے گھسا چلا گیا- کمبخت سینما جا رہی تھی میں نے کچھ ایسا بولا کہ فوراً تیار ہو گئی- میں نے پتہ بتایا اور چلا موٹر کے پیچھے- میرا دل چاہتا تھا- پیروں میں انجن لگ جائے اور کسی طرح موٹر سے آگے نکل جاؤں---- معلوم ہوتا تھا- پیچھے کھسک جاؤں گا، خیر!

وہ اندر گئی اور مجھے باہر روک دیا۔ چاند کی آخری تاریخیں تھیں۔ سامنے لالٹین سسکیاں لے رہی تھی۔

"اوہ---- آپ لوگ---- کتنا بے وقوف---- جلدی کیجئے---- فورا" جایئے' ڈلسی کو بولئے بڑا بکس لے کر آئے" اس نے واپس آکر کہا۔

"مس صاچب----" میں نے کہا۔ "بس---- چلئے چلئے جلدی کریئے۔ جب کیس بگڑ جاتا ہے تو ہمارے پاس ہوتا ہے۔ آپ---- اور کوئی سامان بھی نہیں آپ کا پاس کیسا جنگلی ہوتا۔ ہندوستانی لوگ----" مجھے کھڑے دیکھ کر وہ پھر دھاڑی۔ "آپ کا بیگم صاحب کا جان ڈینجر میں ہے---- اور آپ----"

"میری بہن---- مس صاحب" میں نے جھینپ کر کہا۔ بے ہودہ کہیں کی! جی چاہا تھپڑ دوں۔

"وہ کوئی بھی ہے---- بچہ مر چکا ہے اور لڑکی بیہوش ہے---- آپ---- جلدی۔"

سنن سنن۔ جیسے گولیاں چلیں۔ دور چمگادڑ نے ایک کریہہ قہقہہ لگایا---- اور غوطہ مار کر میرے اوپر سے نکل گئی---- دروازے کی چوکھٹ اچھل کر میرے ماتھے پر لگی----! اور پھر---- تاریکی!

کافر

"ہٹ، ترے مہادیو جی جیسے ہوئے کی شکل کے رات کو دیکھ لو تو بخار چڑھ آئے" میں نے پشکر کی طرف حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اور تیرے، تیرے وہ مستان شاہ جی اور مسٹنڈے پیر جو ہر جمعرات کو تجھے آشیر باد دینے آتے ہیں جیسے ڈاکو چلا آتا ہے۔ میری تو انہیں دیکھ کر ہی گھگی بندھ جاتی ہے" پشکر نے انگلیاں نچا کر کہا۔

"تو تو کافر ہے پشکر" میں نے مولویانہ انداز سے کہا۔ "تو جہنم میں جائے گا فرشتے تیرا بدن لوہے کی سلاخوں سے داغیں گے اور آگ کے کوڑے ماریں گے خون اور پیپ کھانے کو ملے گا"۔

"ہے گندی، کیسی جی متلانے کی باتیں کرتی ہے۔ میں وہ تیرے فرشتے کے منہ پر الٹا دوں گا۔ میں کافر ہوں تو تو کافرنی ہے۔ تو نے اس دن بابو جی سے کہا تھا کہ مجھ سے شادی کرے گی۔ تیرے بھی جہنم میں کچھ کم جوتیاں نہیں پڑیں گی"۔

"ہٹ، میں تو مسلمان ہوں اور تو ہندو ہے۔ جناب عالی سارے مسلمان تو جنت میں چلے جائیں گے۔ ہم بھی مزے سے جنت میں جائیں گے تو ہی رہ جائے گا، دیکھ لیجیو"۔

"بہت رہ گیا، میں تجھ سے بھی اچھی جگہ جاؤں گا۔ تو تو مسلمنٹی ہے تو نرک میں پڑی جلا کرے گی"۔

"سور کہیں کا۔ تو مجھے مسلمنٹی کہتا ہے۔ تو ہی ہے بھنگی، کافر، الو!"

"تو تو بھنگن اور کافرنی ہے۔"

میں نے اس کے ایک زور کا طمانچہ مارا۔ وہ کیوں چوکتا۔ دو دھموکے رکھ دیئے اور ہاتھ الگ مروڑ دیا۔ میں نے بھی اس کی کلائی میں ناخن ایسے گڑوئے کہ چرہا

نکل آئی۔ چاچی جوتی پیزار کی آواز سن کر دوڑی اور بیچ بچاؤ کر دیا۔

"بلشکر کے بچے آنے دے بابو جی کو۔ کیسی گت بنواتی ہوں" چاچی نے بلشکر کو گھونسہ دکھا کر کہا۔ جو دیوار کا گھوڑا بنائے بیٹھا میرا منہ چڑا رہا تھا۔

"چاچی اب اس سورے میں شادی نہیں کروں گی" میں نے رو کر کہا۔

"اور میں تجھ کلوٹی سے کب کروں گا۔" "ماں یہ مجھے پیپ خون کھلاتی ہے' اوق!" بلشکر نے ابکائی کی نقل کرتے ہوئے کہا۔

"ہے رام' ملچھ کہیں کا' چپ۔"

"سچی ماں یہ کہتی ہے سب ہندو نرک میں جائیں گے اور یہ بڑی آئی واں سے جنت میں جائے گی۔"

"نہیں چاچی نہیں جائے گی اور بھیا اور بابو جی بھی نہیں جائیں گے۔ پر یہ الو تو ضرور جائے گا" میں نے وثوق سے کہا۔

"میں گیا تو تیری بھی ٹانگ پکڑ کر گھسیٹ لے جاؤں گا۔"

"بہت لے گیا۔ وہ زور سے کاٹوں گی کہ مر ہی تو جائے گا۔"

"چاچی ہنستے ہنستے لال ہو گئی۔ ارے یہ نرک میں بھی جوتا چلے گا۔ منی جب بلشکر کو مار ڈالے گی تو پھر یہ نرک سے جائے گا"۔

"اور تب بھی نرک میں جائے گا۔ دیکھ لینا چاچی۔ یہ بڑا کمینہ ہے۔"

"دیکھو ماں پھر میں اس کے ڈھیلا کھینچ کر ماروں گا۔"

"کیا ہو رہا ہے" بابو جی نے اپنی چھتری کو بند کرتے ہوئے کہا۔

"ہندو مسلم فساد" چاچی نے ہنس کر کہا۔

ڈرپوک بلشکر بھاگ بھی گیا۔ چاچی مجھے پیار کرتی لے گئی اور مزے دار دال موٹھ کھلائی۔ چاچی تو مسلمان ہے یہ بلشکر ہی کافر ہے۔

دیوالی آئی' بلشکر کا گھر دیوئیوں سے جگمگ کرنے لگا۔ میں نے اس سے فوراً ملاپ کر لیا اور دن بھر چراغوں کیلئے بتیاں بٹیں اور کھیلیں اور شکر کے کھلونے کھاتی رہی۔ چاچی بہت چلائی۔ منی کی بچی ساری روئی مسل مسل کر گٹھلیاں ڈال رہی ہے

مگر میں بھلا کب مانتی تھی۔ شام کو پشکر سج کر نکلا۔ سفید جھاگ سی دھوتی۔ سرخ ململ کا کرتہ' خوب مانگ پٹی کیے لال لال ٹیکہ لگائے چاچی بھی بنارسی ساڑھی پہنے۔ جھانجن جھنکارتی' دیوے سنبھالتی پھر رہی تھی۔ پشکر گھر کی ہر ایک چیز کا محافظ بنا ہوا تھا۔ آج وہ کٹر ہندو تھا اور مجھ سے چھوت کر رہا تھا۔ وہی ندیدہ پشکر جو کتنی ہی دفعہ میرے جھوٹے بیر کھا چکا تھا آج مجھے کچوری دور سے پکڑا رہا تھا۔ میرا دل کڑھ رہا تھا۔

"پشکر! ہمارے بھی چندن لگا دو" میں نے اسے پرانے احسان یاد دلا کر کہا۔

"نہیں" اس نے غرور سے سر ہلا کر کہا۔ "تم ہندو تھوڑی ہو"۔

"نہیں پشکر اب تو میں ہندو ہوں۔ اماں سے نہ کہنا' اچھا"۔

اسے شاید رحم آگیا اور اس نے بڑی اہتمام سے چندن لگایا۔

عید پر میں نے بھی ساری کسر نکال لی۔ پشکر کو کافر کہہ کر اس سے فوراً لڑائی لی۔ مگر جب مہندی سے میرے ہاتھ پیر لال ہو گئے تو میں بے چینی سے اس کے آنے کا انتظار کرنے لگی۔ وہ آیا تو میں بے توجہی سے اپنے ہاتھوں کو گود میں رکھ کر بیٹھی گئی۔

"اہا' منی کے ہاتھ بڑی لال کتر ہو گئے' دیکھیں منی۔"

میں نے اس کے ہاتھ جھٹک کر کہا۔ "ہٹو بھئی ہماری تو عید ہے۔ کوئی تمہاری تھوڑی ہے۔ جناب آپ کوئی روزے تھوڑے رکھتے ہیں۔ مسلمان جو روزے رکھتیں تب ہی ان کی عید آتی ہے۔"

"تو کب روزے رکھتی ہے۔"

"واہ' میں ایک ڈاڑھ کا رکھتی ہوں۔"

"اونہہ بڑی رکھنے والی آئی۔ دن بھر تو بکر بکر کھاتی ہے ایسے ایک ڈاڑھ کا میں بھی رکھ لوں گا۔"

"واہ تم ہندو ہو" میں نے آخری ترپ لگاتے ہوئے کہا۔

وہ کھسیانا ہو گیا۔ "تو اس سے کیا ہوتا ہے"۔

"ہم کل نئے نئے کپڑے پہنیں گے" میں نے اترا کر کہا۔

"میں بھی اپنا نیا کوٹ پہنوں گا۔"

"واہ تم ہندو ہو' تم کیوں پہنو گے۔ ہم تمہیں اپنی سویاں بھی نہیں کھلائیں گے۔"

"اور ہماری دیوالی پر ڈھیر سی کھیلیں ٹھونس آئیں۔ ہم سے چندن بھی لگوالیا۔ بابو جی سے کھلونے بھی ٹھگ لئے اور اب ایسی باتیں کرتی ہے۔ بے ایمان کہیں کی۔"

میں نے فوراً پشکر سے لڑ کر اسے بھاگ جانے پر مجبور کیا۔ لیکن کپڑے بدلتے ہی مجھے اس پر رعب گانٹھنے جانا پڑا۔

میں گوٹہ ٹھپے کے کپڑے پہن کر غبارہ بنی ہوئی جب پشکر کے پاس پہنچی تو اس کا سارا غصہ رفو چکر ہو گیا اور الٹی میری خوشامدیں کرنے لگا۔ مگر میں نے اسے بار بار سمجھایا کہ وہ ہندو ہے اور اسے ہماری عید پر خوش ہونے کا کوئی حق نہیں۔

وہ مایوس ہو کر کہنے لگا۔ "اچھا ہم بھی مسلمان ہوئے جاتے ہیں۔ کتنا مت کسی ہے۔"

مگر بے ایمان کہیں کا ہولی پر پھر کافر ہو گیا اس کی بن آئی اور میرے پیچھے لگے رہنے اور خوشامدیں کرنے کے باوجود اس نے مجھے رنگ کھیلنے سے صاف انکار کر دیا۔

"تو مسلمنٹی ہے" اس نے کہا۔

"اچھا پشکر عید پر آنا کیسا پیٹوں گی کہ یاد کرے گا" میں نے سر ہلا کر کہا۔

"تو پھر تو ہندو ہو جانا" پنڈت جی نے سر کو بے رخی سے موڑتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو مجھے ابرق ملا ہوا گال تو دو۔"

"تو تو اس دن کہتی تھی کہ بدن کے جوں جوں حصے پر رنگ پڑتا ہے وہ دوزخ میں جاتا ہے۔ اب رنگ کیوں مانگتی ہے۔"

"اب میں ہندو ہو گئی" میں نے قائل ہو کر کہا۔

"ہے بے ایمان ہر دفعہ ہندو ہوتی ہے اور پھر مسلمان ہو جاتی ہے۔ پہلے وعدہ کر کہ اب کے سے مسلمان نہیں ہو گی۔"

"اچھا۔"

"اور مجھ سے شادی کرے گی۔ کیوں ہے نا؟"

میں نے یہ آخری شرط بھی مان لی اور عید تو عید میں محرم پر ہی مشرف باسلام ہو گئی اور پیشکر کو یزید کا بچہ کہا۔ کیونکہ وہ کافر اور دوزخی تھا۔

یہ پنڈت بھی کیا بھولی ذات ہے اور کشمیری پنڈت خصوصیت سے بس فرشتہ ہوتا ہے۔ ادھر میں پیشکر کو مارتی ادھر وہ ملاپ کر لیتا۔ بزدل اتنا کہ ذرا سے جو بکرے کٹے تو انہیں تڑپتا دیکھ کر رو دیا۔

"ارے تیرے ابا اتنے بکرے کیوں مار ڈالتے ہیں" اس نے بڑی بڑی آنکھیں حیرت سے پھاڑ کر کہا۔

"ارے بے وقوف! یہ تو ثواب ہے" میں نے عالمانہ لہجہ میں کہا اور اس کے رونے کا مذاق اڑایا۔

"ثواب ہے!--- بکرے کا کاٹنا ثواب ہے؟"

"ہاں اور کیا۔ جب ہم جنت میں جائیں گے تو ان بکروں پر سوار ہو کر پل صراط پر سے گزریں گے۔ پیشکر ہم تو فٹافٹ چلے جائیں گے اور تم رہ جاؤ گے۔"

"میں اپنی سائیکل پر چلا جاؤں گا۔"

میں جل گئی "واہ جناب پل صراط بال سے بھی باریک اور تلوار سے بھی تیز ہے۔ تو دھڑام سے دوزخ میں گر پڑے گا اور ہم بکروں پر ٹک ٹک کرتے چلے جائیں گے۔"

"میں تیرے بکرے پر بیٹھ کر جاؤں گا۔"

"واہ ہٹ میں تجھے دھکیل دوں گی۔"

"میں خود تجھے گرا دوں گا۔"

"کیسے گرائے گا تو" میں نے اسے تھپڑ مارتے ہوئے کہا۔

ایک چشم زدن میں وہ گرا کر دو چپتیں لگا چلتا بنا۔
چوڑیاں ٹوٹ جانے سے میرا کلیجہ پھٹ گیا اور ایسی دہاڑی کہ بابو جی اسی وقت بازار سے چوڑیاں پہنوا کر لائے۔

نہ معلوم کتنی عیدیں اور ہولیاں گزر گئیں۔ زمانہ کے ساتھ ساتھ خیالات بھی بدل گئے۔ ہم دونوں تو گویا مذہب کی فلاسفی ہی کو سمجھ بیٹھے تھے۔ ہولی پر بشنکر آتا اور مجھے رنگ میں شرابور کر دیتا اور ڈھیروں گلال مل دیتا۔

جنم اشٹمی پر اس نے مجھے کرشن کا ایک مرمریں اسٹیچو دیا جس کے پیروں کے قریب ایک چھوٹے سے فریم میں بشنکر کی تصویر تھی۔ تصویر اور مجسمہ دونوں میری میز پر رکھے رہتے اور اکثر میری توجہ کا مرکز بن کر رہ جاتے۔

بشنکر بنارس چلا گیا اور میں علی گڑھ۔ ہمارے اسکولوں کی چھٹیاں بھی مختلف زمانوں میں ہوئیں اور اب عید اور ہولی پر بھی ہم دونوں نہ ملتے۔ خدا دسمبر کا بھلا کرے۔ سب کیلئے برابر سامان لطف لے آتا ہے۔ میں برآمدے میں لیٹی کچھ پڑھ رہی تھی کہ "مسلمنٹی" کی صدا نے مجھے بشنکر کے آنے کی خبر دی۔ میں نے "کافر" کہہ کر اس کا استقبال کیا۔ اس نے میرے منہ پر گلال مل دیا۔

"ارے یہ دسمبر پر ہولی!" میں نے اسے دھکیلتے ہوئے کہا۔

"ہاں یہ گلال میں نے تیرے لئے ہولی پر بچا کر رکھ لیا تھا۔ کیا تو مجھے سویاں نہیں کھلائے گی؟"

"نہیں، تو تو کافر ہے!"

"اور تو کافرنی۔ تجھے اپنا ہولی والا بچپن یاد ہے۔"

"کون سا؟" میں نے چندھیا کر کہا۔

"اب اترائی۔ تو نے وعدہ نہیں کیا تھا کہ مجھ سے شادی کرے گی۔"

"ہٹ بدتمیز!"

"کیوں بنتی ہے۔"

ہم دونوں ہنسنے لگے۔

"سنا ہے مسولینی تم لوگوں پر بڑا ظلم توڑ رہا ہے۔"
"پشکر میری سانولی (کالی سی) رنگت پر ہمیشہ ہی چھینٹا کسا کرتا ہے۔
"ولایتی چوہے تو اپنی خبر لے۔ سنا ہے فی چوہا ایک آنہ چنگی سے انعام ملتا ہے"
میں نے اس کی گوری رنگت پر حملہ کیا۔
ہندو مسلم فساد کے کچھ ذکر پر میں نے اس سے کہا۔
"بھاگ یہاں سے بھئی تو ہندو ہے۔ کہیں چاقو واقو نہ مار دے۔"
"تو ہی تھیٹی ہے میں تو بے چارا بزدل۔ تو ہی سینکڑوں بکرے ہضم کر گئی۔"
"مگر پشکر تم بکرے نہیں، تم تو بیل ہو۔"
اس نے میرے بازو میں وہ زور سے کاٹا کہ میں تڑپ ہی تو گئی۔
"اگر تو اتنی کلوٹی الٹا توا نہ ہوتی میں ضرور تجھ سے شادی کر لیتا۔"
"خیر پشکر میں الٹا توا تو نہیں ہوں۔"
"تو آپ کا مطلب یہ ہے کہ آپ سے شادی کر لوں" اس نے آنکھیں جھکا کر کہا۔
"چپ کافر!"
"جانتی ہو شعراء نے کافر کس کو کہا ہے؟"
"وہ کافر اور ہوتا ہے تو تو گدھا ہندو ہے۔"
"کیا ہندو اور مسلمان گدھے علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں اور یہودی گدھے کیسے ہوتے ہیں؟"
"ہم مختلف مذاہب کی مناسبت سے گدھوں کی اقسام پر بحث کر کے ہنسنے لگے۔
"زمانہ گزرتا گیا۔ پشکر ڈپٹی کلکٹر ہو کر ہمارے قریب کے ضلع میں تعینات ہو گیا۔ اس کی موٹر اتوار کے دن گھس ڈالی جاتی تھی۔ اس نے کئی بار مجھے اپنا ہولی کا بچپن یاد دلایا۔ لیکن میں نے بے تکی بات کہہ کر زبان سے نکالنے کو بھی منع کیا۔
"آخر کیا تو مجھے یوں ہی ڈراتی رہے گی! میں آج ماں سے ذکر کروں گا۔ چاہے پھر غدر ہی کیوں نہ ہو جائے۔ ڈرپوک کہیں کی۔"

"پشکر بڑے جوتے پڑیں گے۔ یاد رکھو ابا پیٹ پھاڑ ڈالیں گے۔"

"اجی ان باتوں سے نہیں ڈرتا۔ لیکن یہ تو سوچو کہ آخر کب تک یہی سوچتے رہیں کہ آسمان سے ہماری مدد کو کوئی آئے۔"

"پشکر یہ تو سوچو کہ ہم اور تم کس قدر معیوب بات کر رہے ہیں۔ ہمارے درمیان ایک خلیج حائل ہے 'مذہب!'"

"اجی گولی مارو اس مذہب کو' مذہب ہمارے فائدے کیلئے ہے نہ کہ ہم اس کی قربانی کیلئے۔"

"تم ابا جان اور چاچا کی دیرینہ محبت کو دیکھو۔ ان کی جو بات شہر میں ہے۔ اس پر غور کرو۔ ہماری شادی سے ان کی کیسی ذلت ہو گی۔ اخبار جنہیں کوئی ڈھنگ کا موضوع میسر نہیں۔ ہماری تصویریں' ہماری عشق بازی اور موجودہ تعلیم کی وہ درگت بنائیں گے کہ جینا دشوار ہو جائے گا غیر مذہب میں شادی کرنا جرم ہی نہیں بلکہ ایک آفت ہے۔ ہماری قوم کے لڑکوں کو یہ اجازت ہے کہ وہ ہندو عیسائی جس سے چاہیں شادی کر لیں۔ لیکن لڑکیوں کو نہیں اور آج تک فخر سے کہا جاتا ہے کہ مسلمان لڑکی کو کبھی عیسائی سے شادی نہیں کرنی چاہئے نہ معلوم کہاں تک یہ فخر بجا ہے۔"

"لیکن میں مسلمان ہونے کو تیار ہوں۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے دوسرے مجھے تمہاری یہ شرط منظور نہیں۔"

"چونکہ میرے لئے تمہارے مسلمان ہو جانے سے کوئی فرق نہ ہو گا۔ تم جب بھی اتنے ہی پاجی رہو گے۔ پند سے اور مذہب سے دور کا بھی لگاؤ نہیں۔"

"تو پھر تو ہندو ہو جا۔"

"ذرا سوچ سمجھ کر بات کر۔ ابھی جو میں کہہ دوں کہ مجھے مرتد بنا رہا ہے تو محلّہ کے سارے قصائی تیری بوٹیاں کر ڈالیں۔ دوسرے اگر میں ہندو ہو جاؤں تو ربڑ کی ناک بھی نہ سلامت رہے۔"

"ہم غلام ہیں' پشکر ہماری کوئی چیز ہماری کہلائی جانے کی مستحق نہیں۔ ہم

سوسائٹی کی ملکیت ہیں، وہ جو کچھ چاہے ہمارے ساتھ کر سکتی ہے۔ ہم اگر چاہیں تب بھی کچھ نہیں کر سکتے۔"

"یہ سب واہیات ہے میں کچھ نہیں جانتا۔ تمہارے بھائی جو ایک بیوی کی موجودگی میں میم لے آئے۔ وہ عیسائی ہے۔ برابر میں نے اسے گرجا جاتے دیکھا اور تمہارے بھائی صاحب کو بھی۔"

"پشکر وہ میم ہے اور تو پنڈت۔ اور میں بقول تیرے مسلمنٹی۔ بس لگا لے حساب!"

پشکر بے چینی سے ٹہلنے لگا "میں اس سوسائٹی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔ سنتی ہو۔ ہم آج ہی سول میرج کر لیں گے۔"

"خواہ مخواہ بکنے سے کیا حاصل۔ تم جانتے ہو ابا کو کس قدر صدمہ ہو گا اور تمہاری برادری تمہارا حقہ پانی بند کر دے گی۔"

"پھر کیا کریں۔ سچ بتا تو کہیں اس پاجی حمید سے تو شادی نہیں کر رہی ہے اور مجھے چکمے دے رہی ہے۔ یاد رکھ اس قدر پٹواؤں گا خان صاحب کو کہ بھول جائیں گے اور علاقہ الگ کورٹ کرا لوں گا۔ دیکھ اگر ہم یوں ڈرتے رہے تو بس ہو چکی زندگی۔"

"تو تو سچ مچ پاگل ہی ہے۔ سوچنے تو دے۔ شاید خدا کوئی راہ بتا دے۔"

"اب بتا چکا خدا راستہ، میں جو بتا رہا ہوں۔ کوتوالی کے قریب سے ہوتے ہوئے داہنے ہاتھ کو نکل چلو۔ وہاں سے بس سیدھی سڑک مل جاتی ہے۔"

"اور وہاں سے واپس آکر ابا کو جوتا۔"

"واپسی کیوں۔ وہاں سے سیدھے دورے پر چلیں گے۔"

"تو یہ مشہور ہو جائے گا کہ میں بھاگ گئی۔"

"نہیں، بلکہ میں تیرے ساتھ بھاگ گیا۔ اٹھ جلدی ہاں۔ تجھے کچھ مہر وہر کیا ہوتا ہے وہ چاہئے میں رجسٹری کرا دوں گا۔"

"مہر میں خود تجھے دوں گی۔ میری تنخواہ تجھ سے ذرا سی ہی تو کم ہے۔"

"اچھا اٹھ تو مہر دے۔"

"مگر جب جی چاہے گا طلاق دے دیں گے۔"

" یہ بھول ہے تو تو ہر وقت لڑتی رہتی ہے۔ گھڑی میں سات طلاقیں دے گی۔ چل جلدی، ساڑھی بدل لے۔"

"اور ربڑ کی ناک!"

"ٹھیک ہے، بڑی ستواں سی لا دیں گے یہ تو ویسے بھی بالکل چپٹی ہے۔"

"تو میں نہیں چلتی" میں نے دروازے کو پکڑ کر کہا۔

"اپنے بس نہیں چلے گی۔" اس نے گھسیٹتے ہوئے کہا۔

"تھوڑی دیر بعد، ہم کوتوالی کی سڑک پر سیدھے ہاتھ کو بڑی سیدھی سڑک پر جا رہے تھے۔

"اب بھی لوٹ چلو" میں نے پشکر کے کان میں کہا۔

"سچ مچ!" اس نے سنجیدہ ہو کر کہا۔

"میں نے سر ہلا دیا۔ خدا جانے نفی میں یا اثبات میں اور پشکر نے گردن پکڑ کر مجھے جھکول ڈالا۔

"کافر!" میں نے اس کی کلائی میں ناخن گڑو کر کہا۔

"شاعروں والا۔"

میں نے سر ہلایا، لیکن اس دفعہ اثبات میں۔
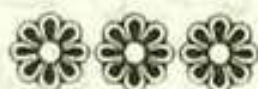
نیرا

پھٹے پرانے گوڈر کے لحافوں اور گدوں کے انبار میں نہ جانے کتنی ہستیاں غافل پڑی تھیں۔

دھائیں، دھائیں۔" جیسے گولیاں چلنے لگیں۔ چوکھی رام کی کھانسی ہوا میں گونجی۔

گوڈر کے ڈھیر کے ایک کنارے کو جنبش ہوئی اور ایک مرجھایا چہرہ جس کے گرد کھچڑی بال سہ کے کانٹوں کی شکل میں لٹک رہے تھے۔ اپنی چپچپاتی ہوئی آنکھوں سمیت جھانکا۔

"دھائیں، دھائیں۔ دھا.... دھائیں۔ اوہ، ہا، دھائیں.... دھک حاق.... تھو" اور قریب کی دیوار پر کیچڑ کا سا پٹاخہ سنائی دیا اور پھر دھائیں شروع ہو گئی۔

"پھر.... پھر.... رمو کی ماں.... اونہہ" اور پھر وہی گولیاں سی چھٹنے لگیں۔

رمو کی ماں یعنی وہی جھڑک چہرے اور کھچڑی بالوں والی رمو کی ماں نے گودڑ میں ایک کھلی ہوئی جگہ ڈھونڈھ کر سر اٹھایا اور ساتھ ہی ساتھ ایک قحط زدہ جسم باہر نکلا۔ کمر کچھ یوں ہی سی جھکی ہوئی اور سینہ اندر کو بیٹھا ہوا تھا۔

"لیٹ جاؤ" اس نے چوکھی کے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کندھے آہستہ سے پیچھے دھکیلتے ہوئے کہا۔

"او.... ہ" اور وہ پیچھے لڑھک گیا۔ رمو کی ماں کا دل کڑھ گیا اس کا یہ مطلب تھوڑی تھا کہ وہ گر جائے۔ وہ اسے پیار سے سہارا دے کر اٹھانے لگی۔

"تھوڑا پانی دیوں۔ کھانسی رکے گی۔" پانی کی گڑدی منہ سے لگا دی گئی اور "دھائیں دھائیں" کے جھٹکوں اور "کھوں کھوں" کے کھچاکوں کے درمیان چند گھونٹ پانی کے چوکھی کے حلق میں پھسلا دیئے گئے۔

"دی.... ای.... بھئی- اوہو- کون لے جھینئے- رمو کی ماں... ہم-" بوڑھے کے گلے سے ایک بات ڈھنگ سے نہ نکل سکتی تھی-" پھر وہی بھیانک کھانسی کے گھونسے لگنے لگے جیسے تازے دھان نئے موسل سے کوٹے جا رہے ہیں"
"رمو" ماں آٹھ دس برس کے میلے کچیلے چیتھڑوں میں لپٹے ہوئے رمو کو دیکھنے لگی- ایک امید بندھی اور پھر ٹوٹ گئی-
اگر آج بھی وہی دودھ ہاٹ نہ گیا تو کیا ہو گا- مٹھا تو گھر میں موجود تھا پر دانے کے نام کنکری بھی نہ تھی- رمو کی ماں جائے تو چوکھی کی دیکھا بھالی کون کرے- نہ جانے کب درد بڑھ جائے-
"نیرا چلی جیئے" چوکھی کا سینہ ملتے ہوئے بولی-
"تو جگا.... ہا-" اور پھر دھان کٹنے شروع ہو گئے- کھانسی ہٹی کٹی جوان جاٹنی کی طرح چوکھی رام پر سوار تھی- رمو کی ماں نے چوکھی کو خوب کمبل سے ڈھک دیا- کمبل بھی تو جی چھوڑ چکا تھا- نہ جانے کتنے سالوں سے وہ چوکھی کے مفلس قبر کی طرح دھنسے ہوئے سینہ پر پڑا پڑا منہ چڑایا کرتا تھا- سوسیوں' چھینٹوں پرانے اونی بنیانوں کے جوڑوں اور پیوندوں نے اسے صورت سے بے صورت بنا دیا تھا- آدمی مر جاتا ہے تو دفن کر دیتے ہیں یا پھونک دیتے ہیں کمبل بے چارے کو تو چھٹکارا ہی نہ تھا-
"نیرا.... او نیرا-" ماں نے گودڑ میں سے اس کا کندھا ڈھونڈھ کر ہلایا-
"اوں" نیرا نے نیند میں روٹھ کر کروٹ بدل لی-
"اٹھ بیٹا باپو جی کا جی اچھا نہیں- ہاٹ چلی جا- اٹھ نا!"
نیرا ہلی بھی نہیں- ماں نے اب کرا پکڑا-
"اٹھتی ہے رانڈ کہ لگاؤں اب" اور گودڑ کے لچھے اس کے جسم پر سے کھسوٹ لئے-
نیرا کھیڑ کھبڑ سر کھجاتی اور بدن توڑتی اٹھی- ماں منتظر رہی- سر کھجاتے کھجاتے ہاتھ نیچے کو ڈھلک آئے اور کمر پر پہنچ کر آرام سے لیٹ گئے- نیرا بیٹھی بیٹھی سو

گئی۔ اب ماں سے صبر نہ ہو سکا۔ گڑوی اٹھا کر چلو بھر پانی چھپاک منہ پر مارا۔
"سوں سوں۔ ہاں۔" نیرا میلے میلے پانی کو چہرے پر ملنے لگی۔ اب رمو کی باری آئی۔

"رمو" باؤلا۔ سڑی دن بھر گاؤں کے چھورے اسے چھیڑتے۔ جس کا جی چاہتا بیگار پر لگا دیتا۔ گھر کا کام کرتے تو اس کی میا مرتی تھی۔ ادھر ادھر سے دو چار گیت سیکھ لئے تھے اور کولہے پر ہاتھ رکھ کر ٹھمکنا بھی آتا تھا اور دوپہر کی چلچلاتی دھوپ سے جی چھوڑ کر سب کے سب پلیا کے نیچے بیٹھ جاتے اور ذرا سی دیر میں محفلِ رقص و سرود جم جاتی۔ پنو اپنی بھرائی ہوئی آواز میں "چرا کر لے گیا جالم مری جنجیر سونے کی" گاتا۔ سیتل اپنے جھلسے ہوئے سینے اور موٹے موٹے ہونٹوں کی مدد سے "دھم دھم پٹاک" طبلے کی گت شروع کر دیتا تو رمو کی کمر پر ہاتھ رکھ کر منہ سے "چھپک چھپک چھئی" کی تال دے کر مٹکنا شروع کر دیتا۔

رمو زنانہ تھا۔ سیتل بھی کہتا تھا کہ وہ بیچ کھیت زنانہ ہے اور پنو کی بھی یہی رائے تھی۔ دیکھ لینا چاہیے۔ پر اس وقت تو رات کے تین بجے وہی نیرا کا محافظ بن کر ہاٹ جا رہا تھا۔ تین چار موثر جھٹکوں اور پھسلتے ہوئے طمانچوں کی مدد سے اسے کھڑا کیا گیا۔ بوریئے کو نفاست سے تہ کر کے "گھوگھی" تیار کی گئی اور رمو چلنے کیلئے تیار جمائیاں لینے لگے۔

دودھ دہی کی بڑی ملسیاں، ایک گھی کی مٹکی، دو چھوٹی چھوٹی بلٹوئیاں پنیری، دو سیر اور چھوٹے چھوٹے باٹ، دھوھڑے کے پتھر، ترازو اور مکھن کی ہنڈیاں ماں نے پتوں میں لپیٹ کر ویسے ہی کونے میں رکھ دیں۔ اوڑھنی کے کونے کی انڈوی بنا کر نیرا کے سر پر جمائی اور ماں نے سہارا دے کر آدھ من کا بوجھ سر پر سنوار دیا۔ ایک دو دفعہ اس کا پتلا دبلا جسم نیم کی کچی لکڑی کی طرح لچکا اور پھر وہ جم کر کڑی ہو گئی۔

چھوٹے تال سے گزر کر پلیا پر سے ہوتے ہوئے دونوں ننھے منے بیوپاری شہر کی سڑک پر چلنے لگے۔ یہ کمبخت جاڑا تو اب کے ایسا دانت پیس کر پیچھے پڑا تھا کہ نرم ہونے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ گرمی تو جیسے تیسے کٹ جاتی۔ چاہو جتنا نہاؤ۔ پیاؤ پر

سے ٹھنڈا ٹھنڈا پانی چاہو جتنا پی لو۔ نہ کپڑوں کی ضرورت نہ کچھ۔ رمو کو تو دھوتی کا بھی مرہون منت نہ ہونا پڑتا تھا۔ سیاہ سوت کا ڈور جو اس کے کچری جیسے پیٹ پر سے پھسل کر کولہے کی ہڈیوں پر مزے سے ٹک جاتا تھا۔ ضرورت سے زیادہ تھا۔ مزے سے تلیا میں ڈبکی لگائی۔ نہ تولیہ کی ضرورت نہ بیدنگ گاون کی حاجت۔ کنارے پر اکڑوں بیٹھ گئے اور لو کے جھپاکوں سے سوکھ گئے۔ مگر اب تو جانے کتنے دن ہو گئے تھے۔ پانی چلو میں لیتا تھا پر چھپکا مارنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ اور پھریری لے کر زمین پر جھٹرک دیتا۔ ہاں دانت خوب انگلیوں سے رگڑتا۔ یہاں تک کہ چوں چوں بولنے لگتا۔

اور یہ جوئیں! ہر وقت نیرا کے سر میں گھوڑ دوڑ مچائے رکھتیں۔ مرنے جوگیوں کو رات میں نیند بھی تو نہیں آتی۔ کھرنڈ بندھتے اور پھر اکھڑ جاتے۔ سرسوں کا تیل آٹھویں دن ہی کھٹی بو دینے لگتا۔ کہاں تک کوئی سر دھوئے۔

نیرا کو پھر نیند آنے لگی۔ "اونہہ" اس نے گردن کی رگوں کو تان کر جیسے نیند کو مار ہی تو بھگایا۔ رمو کے ٹھوکر لگی اور وہ سڑک کے گستاخ روڑوں کو مغلظات سنانے لگا۔

پو پھٹنے میں ابھی دیر تھی اور اس کے بھینی بھینی خوشبو سڑک کے دونوں طرف سے آ رہی تھی۔ دور کہیں سے رہٹ کی سریلی روں روں اور مویشیوں کی اژدہوں جیسی پھنکار ہوا کی سنسناہٹ میں مل جل کر عجیب طلسم پیدا کر رہی تھیں۔

"کھٹا کھٹ" کوئی کٹی کاٹ رہا تھا۔

"ٹوپ ٹوپ۔ چھنن چھنن" دور کوئی اکہ بارہا تھا۔

ہاٹ ابھی بہت دور تھی۔ نیرا کی آنکھیں پھر جھپکنے لگیں۔ باوجود دانت بھینچنے کے ایک جمائی ہونٹوں میں سے مچل ہی گئی۔

"آ..... و۔ ومو۔" نیرا نے وقت کاٹنے کیلئے بولنا شروع کیا۔

"آں....." رمو مرکھلی آواز میں بولا۔

"کوئی کتی دور آ گئے ہوں گے۔"

"بہت دور" رمو رونی آواز میں منمنایا۔
"اور اب ہاٹ کتی اک دور ہو گی؟ ایں؟"
"بہت دور" رمو نے بہت کو کھینچ کر کہا۔

موڑ پر راستہ کاٹنے کیلئے گدگدے گدگدے میلے کے ڈھیر پر سے نیرا آہستہ آہستہ گزرنے لگی، کہ سامنے ٹاپ ٹاپ چھنن چھنن یکہ سرپا آگیا۔ بچنے کیلئے کبھی سڑک کے ادھر گئی کبھی ادھر۔ مگر وہ کدھر بھی نہ جا سکی اور اگر وہ ذرا پرے نہ گرتی تو اکہ کا پہیہ اس کے سوکھے ہوئے سینے کو چرچر کرتا گزر جاتا۔ یکہ والے نے ایک بہن کی گالی نامعلوم شے کو اور دو ایک اپنے گھوڑے اور چابک کو دیں اور نکلا چلا گیا۔

نیرا کا کلیجہ پھٹ گیا اور رمو زنانہ تو رو ہی دیا۔ زمین پر بکھرے ہوئے دہی کے لوتھڑے، چاندی کے ڈبوں کی طرح شب کی تاریکی میں جگمگا رہے تھے۔ زمین دودھ کو مفت کے مال کی طرح چوسنے لگی۔ اور نیرا مکھن میں سے کنکروں کی بجری چھڑانے لگی۔ اُس کڑکڑاتی سردی میں آنسو ساون بھادوں کی جھڑی کی طرح بہنے لگے۔ تشبیہ

"نیرا بھی پٹی اور رمو بھی، مگر گرا ہوا مال واپس نہ ملا۔

چوکھی کی کھانسی میں کمی نہ ہوئی۔ بھیبھڑے دن رات کی دھونس نہ سہہ سکے اور جاڑوں کے رخصت ہونے سے قبل ہی چوکھی چل بسے۔ رمو کی ماں نے ماتھا پھوڑ لیا اور نیرا روتے روتے نیلی پڑ گئی۔ رمو کو پتہ بھی نہ تھا کہ ہنڈیا بھر راکھ وہ کس لئے لئے جا رہا تھا اور جب بھوکے شعلوں نے چوکھی کے کھچی جیسے جسم کو بھوننا شروع کیا تو وہ اپنی آنکھیں دونوں ہاتھوں سے ڈھک کر چلانے لگا۔

اندھیری سنسان راتیں جیسے تیسے کٹنے لگیں۔ نیجھڑ کی روٹیاں اور لوٹا بھر مٹھا حاصل کرنے کیلئے سارے گھر کو دن بھر تیری میرے کھیت میں جتے گزر جاتی۔ نیرا گھاس چھیل لاتی۔ بھینسوں کو بھی دن لگے اور دودھ چرانا شروع کر دیا۔ کون دیکھتا بھالتا۔ کانجی ہاؤس میں ہی ایک تو ضبط ہو گئی۔ دوسری بیانے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔

بھینس جب بوڑھی ہو جاتی ہے تو پتہ نہیں چلتا۔ نہ اس کی کمر جھکے‘ نہ بال کھچڑی ہوں۔ دن بھر کی محنت مشقت نے نیرا کو اور بھی جلدی جوان کرنا شروع کیا۔ جوانی غربت کو نہیں دیکھتی۔ بن بلائے ٹوٹ پڑتی ہے۔ اور بے کہے سنے چل دیتی ہے۔ بھر پیٹ روٹی نہ ملی تو کیا‘ ساؤنے خواب تو کئی روک نہ سکا۔ جمپر اور شلوکے نہ رکے تو کیا جسم نے پیر روک لئے وہ تو بڑھتا ہی گیا۔ پندرہ برس کی نیرا ایک خیالی دنیا میں جھولے کھانے لگی۔ نہ جانے کس نے اس کے کان میں چپکے سے کہہ دیا کہ وہ موتی‘ سیتل اور سندر جیسے نوجوان چھوکروں کو دیکھے تو ایک دفعہ اپنے چیکٹ آنچل کو پھسل جانے دے اور کمر کو خواہ مخواہ ہلکا سا جھٹکا دے کر سنبھل جائے۔ جب وہ تھک ہار کے گدڑی میں سکڑ کر لیٹتی تو اس کی متعفن فضا میں شریک ہونے‘ نہ جانے کون کون آ پہنچتا۔ بھاری بھاری ہاتھ مسکراتے ہوئے گرم گرم اس کے قریب سرکتے ہوئے چلے آتے۔ اور کئی دفعہ وہ روتی ٹٹی ہنسی ہنس دیتی۔ جس پر ماں گھرکی بتاتی۔ جوانی کو خیرباد کہہ کر آئے دن کی روگی بڑھیا طوفان بھرے زمانہ کے سب دکھ درد فراموش کر چکی تھی۔

پڑھنے لکھنے والے لڑکوں کو گاؤں میں کوئی جاذبیت ہی نظر نہیں آتی۔ سیٹھ کے لاڈلے سندر کو بھی گاؤں میں آ کر دن بھر گھر میں پڑے رہنے کے سوا کچھ بن نہ آیا۔ جدھر وہ نکل جاتا خود اس کے ہم عمر اس کی جوتیوں کی خاک چاٹنے لگتے۔ اس کا معیار بڑا اونچا تھا۔ گھسیارنوں اور گوالنوں کو چھیڑ کر وہ اپنی قسمت گرانا نہیں چاہتا تھا۔ ویسے سیٹھ بھی بڑا کٹر تھا۔ گاؤں والوں سے بگاڑنا نہ چاہتا تھا۔ بھولے بھالے کسانوں کو پیار چمکار سے قابو میں رکھنے والا بڑا دیالو ہوتا ہے۔ تو سندر بڑا سیدھا تھا مگر کچھ تو چاہئے زندگی بھی ہوئی نا۔

ایک دن اس نے نیرا کو بڑی سی گٹھڑی سے نبٹتے دیکھا تو یوں ہی شرافت سے مجبور ہو کر ذرا سا سہارا لگا دیا اور ایک گیانی سادھو کی طرح دور چلا گیا۔ لیکن دوسرے روز عین اسی وقت وہ نہ جانے کہاں سے پھوٹ نکلا جب کہ نیرا اپنے بوجھ کو سر پر رکھنے کی کوشش کر رہی تھی تو اسے پھر امداد بہم پہنچائی۔

اس نے گٹھڑی اٹھوا دی اور یونہی بھولے سے اس کا ہاتھ پھسل گیا- نیرا کا پورا جسم کانپ اٹھا- اور وہ بمشکل لچکتی ہوئی چل دی- جب وہ گھر پہنچی تو اسے اتنا پسینہ آیا کہ اس نے فوراً شلوکہ اتار کر دیوار پر پھیلا دیا اور خود دھوتی لپیٹ کر کونے میں بیٹھ گئی اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے سارے جسم پر گھاس کے تنکے رینگ رہے ہیں خود اپنے ہاتھ کے مس سے شرم آنے لگی- رگ رگ میں گدگدی ہو رہی تھی- اس نے جلدی سے ساری کو اور بھی لپیٹ لیا- رات کو دیر تک اسے نیند نہ آئی نہ جانے کس کے ہاتھ اس کے جسم پر سرسرا رہے تھے- بار بار وہ بالوں دار سخت انگلیوں کی گرفت سے اپنی کلائی چھڑا لیتی- اسے رونا آنے لگا- بار بار کروٹ بدلنے پر ماں نے ڈانٹا- "یہ بھینسا کی طرح اینڈ کیوں رہی ہے؟

پھر وہ سو گئی-

سندر ایسا بودا تو نہ تھا- وہ نہ جانے کس سے ڈرتا تھا- چھٹیاں ختم ہونے کو آئی تھیں اور وہ گٹھڑی اٹھواتے اٹھواتے تھک گیا تھا- اب وہ گٹھڑی وہیں کی وہیں خرید لیتا- اور دو چار باتیں کر کے نیرا چلی آتی- مگر یہ تو جھول تھا- اگر گاؤں والوں کے دنگے فساد اور باپ کے جوتے کا خوف نہ ہوتا تو وہ کبھی یوں بے وقوف نہ بنتا- پھر بھی کہاں تک بنتا- پر یہ چھپے چوری کب تک؟ پھر وہ کالج چلا جائے گا- اگر شہر میں بھی نیرا ہو تو کیا برا- شہر میں مکان بہت سستے ہیں- خیال برا نہ تھا-

---

"نیرا تم تو میرن بنا بالکل سکھی رہو گی!" سندر نے ایک دن کہہ دیا-

"تمہارے بنا؟" وہ اس لفظ "بنا" سے ڈر گئی-

"ہاں چھٹیاں جو ختم ہو رہی ہیں-"

اس نے سر لٹکا دیا اور کچھ نہ بولی-

"تو تم بھی چلو نا" سندر نے ضدی بچہ کی طرح کہا-

"میں!" نیرا نے بدک کر کہا-

"اور کیا" نیرا میں اب بھی سندر کیلئے دلچسپیاں تھیں۔

"مگر" اسے چھی کا خیال آیا۔ جو داروغہ جی کے ساتھ رہی تھی تو پھر گاؤں والوں نے اس کی کیسی گت بنائی تھی۔

"کیا ہوا نیرا تمہیں رہنے کو مکان ملے گا۔ کپڑا لتا جو چاہو گی سب کچھ۔"

"پر....." نیرا بے وقوف نہ تھی۔ وہ کئی دفعہ اس قسم کی باتیں شیاما، رمبہ وغیرہ سے سن چکی تھی کہ لوگ بھگا لے جاتے ہیں تو ویسی بات ہوتی ہے۔

"تو ہم بیاہ کرلیں گے" سندر نے ایک نئے خیال کے زیر اثر کہا۔

"بیاہ!" نیرا لجا گئی۔ "باپو جی...."

"باپو جی کو خبر ہی کیوں ہو۔"

"ماں...."

"نہ ماں کو"

"تو یہ کیسا بیاہ؟" اس نے آنکھیں پھیلا کر کہا۔

"یہی کہ ہم تم چپکے سے کرلیں اور بیاہ میں کیا جوکھوں لگتے ہیں۔"

"پر وہ پھیرے اور پنڈت؟"

"کیا پنڈت بغیر بیاہ نہیں ہوتا.... ہاہا۔ بے وقوف نیرا تم ان پڑھ ہو جبھی نا۔ بیاہ تو ایشور کے سامنے قول دینے ہی سے ہو جاتا ہے۔" نیرا کو ہرانے کیلئے کافی تھا۔

"پھر لوگ کیوں کرتے ہیں؟" وہ پھر بولی۔

"لوگ بے وقوف ہیں' بے کار' فضول میں۔ بھل پنڈت کے اڑم ٹڑم بک دینے سے ہی بیاہ ہوتا ہے۔ ویسے نہیں ہوتا اور نیری ہمارا تو بیاہ ہو بھی گیا۔" وہ شرارت سے مسکرایا۔

"ہٹ" وہ شرمانے لگی۔ سندر کو ترس آگیا۔ نہ جانے نیرا کی معصومیت پر یا جہالت پر "بیاہ پھر کیا ہوتا ہے؟"

اور ایسا ہی ہے تو لاؤ بھانوریں بھی ڈال لیں۔ آگ بھی سلگتے کتنی دیر لگتی ہے۔ اور تم گھونگھٹ بھی مار لینا۔" وہ زور سے ہنسا۔

"ماں" اس نے ڈرتے ہوئے پوچھا۔
"اونہہ۔ پھر وہی۔ نہ ماں نہ باپو جی۔ خواہ مخواہ دنگا مچے گا وہ کوئی منع تھوڑی کرے گی۔ میں کسی کو بتانا نہیں چاہتا۔ یہی تو ساری بات ہے۔"
نیرا چپ رہی۔ رمو' ماں اور بہت سی باتیں تھیں جو اسے یاد آنے لگیں۔
"سوموار تک سوچ بچار کر لو۔ اگر تم نہیں جاؤ گی تو نیرا.... آگے اس نے نیر کے تخیل پر چھوڑ دیا۔

نیرا گھر پہنچی تو ماں نے گالیوں سے آؤ بھگت کی۔
"رانڈ سارے سارے دن نہ جانے کہاں مری رہت ہے۔ نہیں ہڈیاں توڑن کو رہی ہوں۔ بنا گھر گئی رہے۔"
نیرا غرور سے سر اٹھائے آگ سلگانے چلی گئی۔ بڑھیا نے پیچھا نہ چھوڑا۔
"پہلے بول کہاں رہتی" اس نے دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر داروغہ جی کی طرح پوچھا۔
نیرا نے سب تو کام کر لیا تھا پھر غصہ کیسا۔ وہ کہیں گئی تھی کسی کو کیا؟
"بڑی سیر سپاٹے کی پڑی ہے سارا سارا دن یوں ہی گھمنا پھرنا۔"
بڑھیا نے دانت کٹکٹائے۔
"سارا دن تو کام کیا' اب...."
"اوپر سے گراتی ہے چھنال۔"
"تو کون سا سکھ دیتی ہو جاؤ۔ نہیں کرتی کام دھام۔ ہاں نہیں تو" اس نے گردن گھما لی۔
بڑھیا نے دو ہاتھ پاس پڑے چیلے کے لگائے۔
"کرے گی کیسے نہیں کام۔ نہیں تو میں تیرے آگے تھالی پروسوں۔"
"نہیں کروں گی میں کام۔" نیرا نے چیلے سے بچتے ہوئے کہا۔

"تو جا کھا کہیں اپنے یاروں کے ہاں۔ یہاں تو کام ہی کرنا ہو گا۔"

"چلی ہی جاؤں گی۔" نیرا نے منہ پھلا کر کہا۔

"اور کیا بیٹھا ہے نا کوئی تیرا خصم" وہ جانتی تھی کہ نیرا بکواس کرتی ہے۔

نیرا کو بڑھیا کی بھول پر بڑی ہنسی آئی۔ پر وہ چپ رہی اور سوموار کی راہ تکنے لگی۔ آج اگر اماں اسے نہ ڈانٹتی۔۔۔۔ تو شاید سوموار کو وہ کہیں نہ جاتی اور شاید پھر مجھے اس کی بابت کچھ بھی معلوم نہ ہوتا۔ مگر بڑھیا کیوں مانتی۔ سوموار آیا پتوں کے ڈھیر کی آگ جلی اور ضدی چھوکری نے پھیرے بھی کئے اور گھونگھٹ بھی کاڑھا۔ پر نہ جانے کیوں کلیجہ میں دھکڑ پکڑ ہو رہی تھی۔ کوئی ہنس ہنس کر کہہ رہا تھا۔ یہ بیاہ نہیں ہوا۔ یہ بیاہ نہیں ہوا۔"

بدمعاش لڑکی اور وہ بھی کنگال۔ اگر بھاگ جائے تو نہ تو پولیس دوڑتی ہے اور نہ اخباروں میں چھپتا ہے۔

سندر طالب علمی ہی کے زمانہ میں گرہستن کے مزے لینے لگا۔ صبح صبح جب گرم گرم پراٹھوں اور چاء کا ناشتہ کر کے وہ کالج جانے لگتا تو نیرا سے وہ بالکل ایسے ہی پان لگانے کی فرمائش کرتا جیسے اس نے اپنے موٹے توند والے باپ کو کرتے دیکھا تھا۔ اور جب وہ اس کے منہ میں پان دیتی تو اس کی انگلی آہستہ سے دانتوں میں پکڑ لیتا۔ نیرا کو اس کی یہ شرارت بہت ہی بھاتی۔

تین مہینے گزر جانے کے بعد بھی سندر کا جی نیرا سے نہ اکتایا۔ یہ بڑی نئی بات تھی۔ یہ اس کے اصول کے قطعی خلاف تھا۔ وہ چند دن یا زیادہ سے زیادہ چند ہفتوں سے زیادہ کا جھول ہی نہیں پالتا تھا۔ نیرا کی حیثیت نوکرانی کی سی تھی۔ پر جب وہ کام کاج کر کے بن ٹھن کر سندر کا سر اپنے زانو پر رکھ کر تیل ڈالتی تو وہ پوری گھر والی نظر آتی۔ نیرا تو ایک دریا تھی جس سے سندر سیراب ہی نہ ہو سکتا تھا۔ ابھی کیا جلدی تھی۔ بیوی تو تھی نہیں کہ ایک دفعہ جو ڈھول کی طرح گردن میں لٹکی تو سدا جھولتی رہی۔ ہر سال بچہ دے تو کچھ نہیں۔ پھول پھال کر بورا ہو جائے تو بھی نبھاؤ۔ نیرا کو جب وہ چاہتا چھوڑ دیتا۔ پر ابھی کیا جلدی تھی۔ نئی موٹر خریدنے سے

پہلے۔ پرانی کو جتنا چلا لو اچھا ہے۔ سندر کی شادی دور تھی۔

تین چار دن سندر گھر سے کھویا سا رہا۔ وجہ کچھ بھی نہ بتلائی۔ ذرا فکر مند بھی رہتا تھا۔ نیرا اگر وہ روٹھ جاتا منا لیتی۔ ہنستا تو روٹھ جاتی۔ پر روتے ہوئے سندر کو قابو میں لانا اس نے نہ سیکھا تھا۔

"پتا جی آئے تھے اصل میں میں انہیں بتانا نہیں چاہتا تھا" اس نے آخر کو بتا ہی دیا نیرا کو کیا خبر کہ وہ سندر کی سگائی پکی کر گئے۔

تو سندر، باپ کو نیرا کے متعلق علم نہ دینا چاہتا تھا۔ اوہو، اس کی اس میں ہتک تھی جیسے وہ اس کی بیوی نہ تھی۔ نیرا چپ رہی۔ آخر اس میں چھپانے کی کیا بات تھی۔ کیا لوگ بیاہ نہیں کرتے اور سندر کیا ایسا شرمیلا تھا۔

"مجبوری ہے نیرا" آخر کب تک نہ کہتا کوئی، ایسا بودا تھا۔

"کیسی مجبوری۔ بابو جی؟ آپ تو کہتے تھے...."

"ہاں کہتا تو تھا پر نیرا تم نہیں سمجھتیں، سیٹھ جمنا لال کی بیٹی ہے۔ بابو جی کی رال ٹپک پڑی ہے۔

"اور تمہاری" پر نیرا نے کہا نہیں۔

"تم جانتی ہو اس سال روئی کے بیوپار میں گھاٹا بیٹھ گیا۔

"روئی کے بیوپار میں گھاٹا بیٹھ گیا ہے تو بیٹھ جائے۔ نیرا کی زندگی کا بیوپار کیوں بیٹھ جائے" کون پوچھتا ہے۔

"یونہی کہتے ہو باپو جی...."

"نہیں نیرا سچ باپو بڑا زور ڈال رہے ہیں۔ وہ کبھی ایسی سونے کی چڑیا ہاتھ سے نہ جانے دیں گے۔"

"اور تم!" نیرا نے پوچھ ہی لیا۔

"میں، میں...." وہ چکرایا "میں کس گنتی میں ہوں۔"

"اور میرے ساتھ جو بیاہ ہوا تھا۔"

"نہیں ہوا" سندر عارئیتہ" جھینپ گیا۔

نیرا کے کلیجہ پر جیسے کسی نے موگری مار دی۔

"اور وہ پھیرے....."

"وہ سب دھوکا تھا۔ کون مانے گا۔"

"تم تو مانو گے' کہتے تھے کہ قول دینے ہی سے تو پرماتما کے آگے بیاہ ہو جاتا ہے۔"

"نہیں ہوتا۔ جب تک چار لوگ نہ ہوں۔ پھیروں سے کیا بیاہ ہوا جاتا ہے۔"

"تم نے کہا تھا کہ چار لوگ نہ ہوں تب بھی....."

"وہ یونہی کہہ دیا ہو گا۔"

"اس یونہی کی بھی خوب رہی۔"

"تو میں تمہاری کوئی نہیں۔"

سندر کو بڑا دکھ ہو رہا تھا مگر وہ مجبور تھا۔ اس نے صرف سر ہلا دیا۔ نیرا نہ روئی نہ پیٹی اس نے خاموش ہو کر ایک طرف سر ڈال دیا۔

وہ اسے دیر تک چمکارتا رہا۔

"میں سال پر تمہیں روپیہ بھیج دیا کروں گا۔ تم بڑی سکھی رہو گی۔"

"سکھی' سکھی تو وہ کبھی رہی نہ رہے گی۔ ہاں یہ چند ماہ اس کی زندگی میں ہمیشہ ستاروں کی طرح جگمگاتے رہیں گے ایک بار سہی پر اس نے سکھ دکھ دیکھ تو لیا۔ اوروں کی طرف دیکھو جنہیں یہ بھی نہیں ملتا۔

اسے چھمی کا خیال آیا۔ دھتکاری کتیا کی طرح اپنے بچے کو لٹکائے کونے کونے میں منہ چھپاتی پھرتی ہے۔ کہنے کو تو یہ گنوار بڑے غریب ہیں پر ایسی باتوں میں نہ جانے کدھر سے شرم آنے لگتی ہے۔ کچھ نہیں تو "عزت عزت" ہی پکارنا شروع کر دیا۔ وہ گاؤں تو نہ جائے گی' پھر کہاں؟

روپا کی سرد ہوئی دکان چل نکلی اور نیرا اس کی ہو گئی- تندرست جسم اور چمکتے ہوئے گالوں سے اس نے بھرپور فائدہ اٹھایا- یہی ایک عورت کی دولت ہے چاہے وہ کوڑی ہے چاہے رانی- جب تک بدن چست ہے اور گال چکنے ہیں سب کچھ ہے اور پھر؟ پھر تو کچھ بھی نہیں- نیرا کو یقین بھی نہ تھا کہ وہ سوائے گوبر تھاپنے اور گھاس چھیلنے کے کسی اور مصرف کی بھی ہو سکتی ہے- اب یہاں تو اس کی یہ حالت تھی کہ کیا امیر اور کیا غریب ہر ایک کیلئے اس کے آشرم کے دوارے کھلے ہوئے تھے- ایک چھوڑ دس سندر، بیس سیتل اور ان گنتی سیٹھ موجود تھے- جب شہر کے نوجوان اور تندرست لوگ اپنے اجڑے ہوئے گھر، بڑی بی چرخ بیویوں سے عاجز آ جاتے تو سکون قلب کی تلاش میں اسی کے در کی خاک چاٹتے-

کبھی ایک آدھ تھکا مارا مرگھلا سا کلرک دو چار ٹوٹی ہوئی بیڑیاں جیب میں ڈالے اس کے دربار کرم سے بخشش چاہتا تو روپا بھیڑیے کی طرح اس پر غرا کر دوڑتی اور وہ جلی کٹی باتیں کہتی کہ وہ اپنا سا منہ لے کر چل دیتا تو نیرا کا جی بے چین ہو جاتا اگر وہ روپا سے نہ ڈرتی ہوتی تو ضرور اس مردہ دل دکھی کو واپس لے آتی اور اس کا تھکا ماندہ سر اپنے معطر سینہ سے لگا کر اسے تسکین دیتی، وہ بھی تو کبھی دکھی تھی-

ایک سندر نے اسے بیوی نہ بنایا تو کیا ہوا- کیا مرغ نہیں ہوتا تو اذان نہیں ہوتی- اب وہ سارے جگ کی بیوی تھی ایک چھوڑ دس سندر، بیس سیتل موجود تھے- پر جب کوئی نیا مہمان آتا تو وہ کسی سوچ میں پڑ جاتی- مقدس آگ کے گرد وہ بھانورے پڑے دیکھتی اور اپنا سر ایک نئی دلہن کی طرح جھکا لیتی اور وہی آگ ایک دم بھڑک اٹھتی اور پھر سکھ ہی سکھ اور پھر سکھ کیا ہوتا ہے-

سب ہی آتے تھے- پر اس کا سندر، سب سے پہلا سندر کبھی نہ آیا- نہ جانے وہ کہاں تھا- شاید کسی نئی نیرا کے سنگ- مگر نیرا کو اتنی فرصت کہاں تھی کہ وہ ماضی کے متعلق سوچ سکے- حال اور مستقبل ہی اس کیلئے بہت تھے اور پھر اس کی نئی ساڑھی میں فیتہ بھی تو نہیں لگا تھا- نہ ہی درزی نے شلوکہ ابھی دیا تھا- سوموار کا

وعدہ تھا۔ یہ "لپ اسٹک" تو بس مصیبت تھی۔ آج منگایئے اور کل آدھی لو۔ پرسوں ختم۔ روپا "بٹنی" بھی تو نہیں منگا دیتی۔ نہ جانے یہ جاپانی روغن معدے کیلئے مضر تو نہیں ہوتا۔

اس کا دل نرم تھا۔
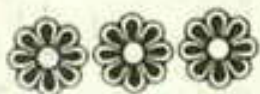
عصمت کے افسانے گویا عورت کے دل کی طرح پر پیچ اور دشوار گزار نظر آتے ہیں۔ مجھے یہ افسانے اس جوہر سے مشابہ معلوم ہوتے ہیں جو عورت میں ہے۔ اس کی روح میں ہے۔ اس کے دل میں ہے۔ اس کے ظاہر میں ہے' اس کے باطن میں ہے۔

(کرشن چندر)

عصمت کی شخصیت اردو ادب کے لئے باعث فخر ہے۔ انہوں نے بعض ایسی پرانی فصیلوں میں رخنے ڈال دیئے ہیں۔ کہ جب تک وہ کھڑی تھیں' کئی رستے آنکھوں سے اوجھل تھے اردو ادب میں جو امتیاز عصمت چغتائی کو حاصل ہے' اس کا منکر ہونا کج بینی اور بخل سے کم نہ ہوگا۔

(پطرس بخاری)

RHOTAS BOOKS
Ahmed Chambers 5 Temple Road Lahore

Rs. 45/=